ساغر صدیقی



شخصیت

فن

اور

کلام

یونس ادیب

ساغر صدیقی

شخصیت، فن اور کلام

ترتیب و پیشکش:

یونس ادیب

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ـــــ حیدرآباد ـــــ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس - لاہور
قیمت : ۲۰ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ - چوک انارکلی - لاہور



ابھی تک بے کفن سی ہے، میری وحشت کی عریانی
یہ کس امید پہ گھر کو بیاباں کر لیا میں نے
کبھی ساغر بکف میں وجد میں آیا جو لہرا کر
تو اپنے ساتھ دنیا کو بھی رقصاں کر لیا میں نے
ساغر صدیقی

قطعہ تاریخ وفات ساغر صدیقی

یزدانی جالندھری

ساغر نے رختِ زیست جہاں سے اٹھا لیا
افسردہ اس کے غم میں ہیں یارانِ انجمن

وہ شہریارِ شعر، وہ درویشِ بے ریا
نظمیں تھیں جس کی مظہر معراجِ فکر و فن

نعتوں میں جس کی جذبۂ حبِ رسولؐ تھا
غزلیں تھیں جس کی حسن و جوانی کا بانکپن

یزدانی حزیں نے لبِ جام رکھ کے ہاتھ
تاریخِ رحلت اس کی کہی ساغرِ سخن

"۱۹۷۴" - ۱۹۷۱ + ۳

نیک تمناؤں کے ساتھ

ساغر صدیقی کے بارے میں ایک کتاب ترتیب دینے کا مقصد بکھرے بکھرے ساغر صدیقی کو سمیٹنا ہے۔ میں نے اس کی زندگی میں ہی اس پر ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب بکھرے بکھرے ساغر صدیقی کو سمیٹنے میں کئی ہاتھ میرے ساتھ شریک ہو گئے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں میرے اپنے جذبے کے ساتھ نیک دل افسانہ نگار اے حمید کا بھی جذبہ شامل ہے۔ جنہوں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔ منیر نیازی اخلاق احمد دہلوی، ظہیر کاشمیری، کلیم اختر اور عنایت حسین بھٹی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری خواہش پر ساغر کے بارے میں اپنے احساسات قلم بند کیے۔ منتظم اعلیٰ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور محترم رب نواز کا پُرخلوص تعاون بے حد قابلِ ستائش ہے جنہوں نے فقیر ساغر صدیقی کو آنے والی نسلوں کے لیئے محفوظ کرنے میں میری حوصلہ افزائی کی اور یوں میں اس قابل ہوا کہ آپ کی خدمت میں ساغر صدیقی کو پیش کر سکوں۔ اگرچہ یہ کتاب ساغر کی زندگی، شخصیت اور فن پر ایک اجمالی جائزے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن برسوں بعد جب کوئی ساغر کو دیکھنا اور جاننا چاہے گا تو یہ کتاب ساغر سے مستقبل کی نسل کے تعارف کا ایک ٹھوس ذریعہ ثابت ہو گی اور پھر ساغر خود بخود بتا دے گا کہ

بہر صورت ہماری ذات سے ہیں سلسلے سارے
جنوں کی سادگی ہم ہیں خرد کا بانکپن ہم ہیں

مخلص

یونس ادیب

رونق جشن رنگ و بو کے لیے
زخم حاضر ہیں داغ حاضر ہیں

نام ــــــ محمد اختر
ابتدائی قلمی نام ــــــ ناصر حجازی
پیدائش ــــــ انبالہ (مشرقی پنجاب)
آغاز ــــــ امرتسر

استادوں میں بہت سے بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے، لیکن وہ کہا کرتا تھا "خدا ہی میرا استاد ہے۔ خدا ہی میرا وارث ہے"۔

تخلیقات ــــــ لوحِ جنون، شیشۂ دل، غم بہار، شبِ آگہی، سبز گنبد (نعتوں کا مجموعہ) حضرت سلطان باہو کے دوہوں کا اردو ترجمہ،

گیت

موجیں تڑپ رہی ہیں کنارے اداس ہیں ــــــ فلم انوکھی داستان
مینوں ڈنڈیاں کرا کے دے گیا ــــــ جبرو
میرے ٹوٹے من کی بات زمانہ کیا جانے ــــــ شالیمار
آگ من کو لگائیں نظارے۔ سجنوا ہمارے بسیں پردیس ــ باپ کا گناہ
کوئی اپنی نشانی دے گیا۔ دل لے گیا ــــــ دو آنسو
دل کو ملا دلدار ــــــ باغی
اب شمع اکیلی جلتی ہے اور روٹھ گئے ہیں پروانے ــــــ غلام
چاند چمکا تھا پیپل کی اوٹ سے ــــــ انجام
محفلیں لُٹ گئیں جذبات نے دم توڑ دیا ــــــ سرفروش
دیکھے زمانہ میرا نشانہ ــــــ
میری زلفوں کی لٹ بڑی جادوگر ــــــ

تاریخ وفات ــــــ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء

مدفن ــــــ قبرستان میانی ــــــ لاہور



فقیہہِ شہر نے تہمت لگائی ساغرؔ پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے



حدیثِ ساغر بزبانِ ساغر

مری زندگی زنداں کی ایک کڑی ہے ۱۹۲۸ء کے کسی ماہ میں پیدا ہوا ہوں۔ گھٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ سہارنپور اور انبالہ کی آغوش میں گذارا۔ انبالہ اردو اور پنجابی والے علاقہ کا سنگم ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور کہاں پیدا ہوا ہوں یہ سب میرے لیے علی بابا چالیس چور کے پُراسرار غار کی کہانی ہیں۔ میں نے دنیا میں خداوندِ رحیم و کریم سے بہن بھائی کا عطیہ بھی نہیں پایا۔ یہ معلوم نہیں کہ خدا کو اس تنہائی سے یگانہ بنانا مقصود یا بیگانہ؟ بہر حال شاید مری تسکین قلبی کے لیے کسی کا نام بھائی رکھ دیا ہو۔ اس طرح ایک وجود کا تذکرہ میرے بارے میں لکھنے والوں نے کیا ہے جو سراسر غلط ہے دنیا کی چھ سمتوں پر نظر رکھنے والے صاحب فراستِ لاہو کی سڑکوں پر مجھے جب چاہیں ٹوٹا ہوا بازو کالی چادر میں چھپائے، احساس کے الٹے پاؤں سے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی بھائی بہن ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا! میں نے لوگوں سے اپنا نام محمد اختر سنا۔ البتہ ایک پُرشکوہ ماضی کی سرسراہٹ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے سُنی ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب ذرا سوجھ بوجھ کا زمانہ آیا تو ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے پرانے صندوقوں میں دیمک چاٹتی ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ شاید ان کے پڑھنے والے ۱۸۵۷ء کی گھٹاؤں میں گم ہو چکے تھے۔ ہاں رات کی تاریکی میں ایک ڈیوٹ پر روشنی پھیلانے کی جُستجو کرتا ہوا ایک دیا میرے مشاہدے کی پہلی چیز تھی۔ اس گھر میں مجھ سے پہلے حاجی محمد حنیف اور حاجی محمد حسین نام کے دو بزرگ آباد تھے۔ یہ کتابیں شاید انہی کی تھیں، یہ بزرگ انبالہ شہر کی سماجی زندگی میں اچھی خاصی شہرت کے حامل تھے ان کی پکی اور بیل بوٹوں والی قبروں کا کوئی پتھر شاید آج بھی وہاں کے قبرستان کے کسی کونے میں موجود ہو۔

میں نے اُردو اپنے گھر میں پڑھی۔ ایک چالیس پچاس سالہ بزرگ جن کا نام حبیب حسن تھا بچوں کی تربیت و تعلیم کا بہت ذوق رکھتے تھے۔ یہیں مجھ میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مری

عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی کہ میں اُردو میں اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ اکثر خط لکھوانے والے اپنی گذارشات کو میرے اندازِ بیاں میں سُن کر داد و تحسین سے نوازتے تھے۔ میں نے بچپن کا دور بھی غربت میں صبر و شکر کے ساتھ گزارا ہے جو کچھ ملتا اسی پر بخوشی قناعت کرتا۔ اُس وقت کے تمام اردو روزناموں (زمیندار، احسان، انقلاب) کا مطالعہ میرا شغل تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی میں نے آج تک اردو زبان کا کوئی لفظ غلط پڑھا یا لکھا ہو۔

میں نے شروع میں ناصر حجازی تخلص رکھا۔ تقریباً دو ماہ بعد پھر مجھے یہ تخلص واضح دکھائی نہ دیا۔ تب میں نے اپنا تخلص ساغر صدیقی پسند کیا، جو آج تک موجود ہے۔ دس بارہ سال کی عمر میں میں اپنے استاد حبیب حسن کے ساتھ امرتسر میں رہا کرتا تھا۔ میں چھوٹی عمر میں بھی بیس یا ئیس سال کا سنجیدہ نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ میری عمر ۱۶ سال کی تھی جب ۱۹۴۴ء میں امرتسر میں جامعہ السنہ ہال بازار میں جو علومِ شرقیہ کی بہترین درس گاہ تھی، ماہانہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے جن میں شرکت کرنا میرے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات تھی۔ صحت بہت اچھی تھی۔ رگوں میں زندگی کا جوان خون رقص کرتا تھا۔ ادبی محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں ہی اردو مجلس کے نام سے ڈاکٹر تاثیر مرحوم اور شمس العلما تاجور نجیب آبادی (دیال سنگھ کالج میں پروفیسر رہے) کے زیر سایہ ایک بزم قائم ہوئی۔ اُردو زبان کی ترویج و ترقی اس کے اغراض و مقاصد تھے۔ اس کے مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہوتا رہا ہوں۔ امرتسر میں عرشی امرتسری، شمس مینائی مرحوم، فرخ امرتسری، مرزا بیضا خاں، مروی ایرانی، عیسیٰ امرتسری ان لوگوں نے میری صلاحیتوں اور خوبیوں کو بہت سراہا۔

۱۹۴۵ء میں میں ولی صابر رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور کلیر کے عرس میں شریک ہوا۔ کلیر میں عرس مبارک کے موقع پر تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے تمام اہل فن اکٹھے ہوتے تھے۔ عرس کے آخری ایام میں کاشانۂ احباب سہارنپور ایک بزم شعر و سخن منعقد کرتے تھے۔ جس میں چیدہ شعراء کرام شامل ہوتے تھے۔ انور صابری نے اس محفل میں میرا تعارف کرایا۔ دلّی میں نواب سائل قلعہ معلّٰی کی اُردو کے نقشِ آخری تھے۔ ان کو کلام سُنایا تحسین کے پھول سمیٹے اور مرقد غالب کی زیارت کی۔

امرتسر میں دوسری جنگ عظیم کی باغی آزاد ہند فوج کے تین جرنیلوں کے استقبال کے لیے جلیانوالہ باغ میں تقریباً تیس یا چالیس ہزار کے مجمع میں میں نے زندگی میں پہلی بار اسٹیج پر آ کر نظمیں پڑھیں۔ اس جلسہ میں پڑھی جانے والی نظم کا ایک شعر اور ایک مصرعہ مجھے یاد ہے، جو یوں تھا۔

شعر،
ہو جس کا رخ ہوائے غلامی پہ گامزن
اس کشتیٔ حیات کے لنگر کو توڑ دو

مصرعہ، تہذیب نو کے شیشہ و ساغر کو توڑ دو

امرتسر میں امین گیلانی پہلے ادبی دوست تھے، نفیس خلیلی مرحوم، ظہیر کاشمیری، احمد راہی مرزا جانباز سے نشست و برخاست رہی، ساحر لدھیانوی، نریش کمار، شاد مرحوم، لطیف انور گورداسپوری مرحوم جن کا میں علم و ادب کے میدان میں بے حد احترام کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں میری یادداشت کا ابتدایہ ہیں۔ عطاءاللہ شاہ بخاری جیسے جیّد عالم کے دستِ شفقت سے سرفراز ہوا۔ لدھیانہ میں مولانا عزیزالدین عظامی مرحوم سے ملا جو مولانا گرامی مرحوم کے شاگرد اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ جالندھر، لدھیانہ، گورداسپور کے کئی مشاعروں میں شرکت کی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت میری عمر ۱۹ برس کی تھی۔ جیسے جیسے حالات کا ارتقاء جاری رہا میرا شعور اسرار ہائے کائنات کا حامل ہوتا گیا۔ تقسیم کے بعد سے صرف شعر لکھتا ہوں شعر پڑھتا ہوں، شعر کھاتا ہوں، شعر پیتا ہوں۔

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں کو مُسکرا کے اسی جام سے لگا لے

ساغر — میرا دوست

یونس ادیب



ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن
اتنی حدیثِ بادہ و ساغر بُری نہیں

اللہ
حق حق حق

ساغر کو پہلی مرتبہ میں نے ۱۹۴۶ء میں دیکھا تھا۔ ان دنوں دہلی دروازہ کے باہر آغا بیدار بخت کے کالج دارالعلوم السنہ شرقیہ میں حلقہ اربابِ علم کے ہفتہ وار علمی ادبی اور تنقیدی اجلاس ہوا کرتے تھے اور معروف ادیب اور شاعر باقاعدگی سے حلقہ اربابِ علم کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ امرتسر سے بھی اہلِ علم و ادب حلقہ ارباب علم میں آتے اور پیسہ اخبار میں حافظ امرتسری کی دُکان پر دو تین دن تک لاہور اور امرتسر کے ادیبوں اور شاعروں کی ملاقاتیں جاری رہتیں۔ اس لیے کہ حافظ صاحب بھی امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ امرتسر سے آنے والا ہر ادیب اور شاعر حلقہ کے اجلاس میں شرکت کے بعد حافظ کی دکان پر ضرور آتا تھا اور یوں حافظ صاحب لاہور اور امرتسر کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ حافظ امرتسری سے میرے تعارف کا ذریعہ اطہر نظامی ہے۔ اطہر نظامی کا تعلق لاہور سے تھا اور امرتسر کے استاد عیسٰے نادم کا نظامی مرحوم کا شاگرد تھا۔ استاد عیسٰے حافظ صاحب کے بھی استاد تھے۔ وہ تقریباً ہر اتوار کو حلقہ کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے لاہور آتے اور ہر بار ان کے ساتھ امرتسر کا کوئی نہ کوئی شاعر ضرور ہوتا۔ مجھے شعر گوئی کا شوق تھا اور میٹرک پاس کرنے کے بعد بیکار تھا۔ نوکری کے لیے حالات سازگار نہ تھے۔ تحریک پاکستان اپنے نقطہ عروج پر تھی اور برصغیر میں تشویشناک صورتحال سے اقتصادی ابتری تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ان حالات کی بے چینی کا واحد سہارا شعر و ادب سے میرا قدرتی لگاؤ تھا۔ میں دن میں دو تین مرتبہ حافظ صاحب کی دکان پر ضرور جاتا اور حلقہ ارباب علم میں ہر اتوار کو شرکت میرا معمول تھی۔

سردیوں کی ایک اتوار کو حلقہ کا اجلاس شروع ہونے میں ابھی ابھی کافی دیر تھی میں اطہر نظامی کے ساتھ حلقے میں پہنچا تو برآمدے میں سیاہ شیروانی، سفید پاجامہ اور سفید چپل پہنے تیکھے خدوخال اور سنہری سانولی رنگت والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے گھنگھریالے سیاہ بال گردن پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں مستی نواز معصومیت تھی اور وہ غالباً نعیم ہاشمی سے باتیں کر رہا تھا۔ اطہر نظامی سے وہ بڑے تپاک سے ملا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا، میرا نام ساغر صدیقی ہے۔

اس کی دوستانہ مسکراہٹ اور لہجے میں حد درجہ اپنائیت تھی اور حلقہ کا اجلاس شروع ہونے تک ہم اس طرح باتیں کرتے رہے جیسے برسوں سے ایک دوسرے سے آشنا ہوں۔ اس روز ساغر صدیقی حلقہ میں اپنی غزل پڑھنے کے لیے آیا تھا اور اجلاس کی کارروائی کے آغاز پر آفا بیدار بخت نے ساغر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ جواں سال ساغر صدیقی پہلی مرتبہ حلقہ میں اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کرنے آئے ہیں۔ یہ امرتسر کے نئے شاعروں میں ابھرتے ہوئے شاعر ہیں اور ان کے ترنم میں جادو ہے۔ اس کے بعد صدر مجلس نے ساغر کو غزل پڑھنے کی دعوت دی۔ حاضرین اس کے ترنم کا ذکر تو سن چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے فرمائش کی کہ ساغر ترنم میں غزل پڑھیں۔ تنقید کے لیئے پیش کی جانے والی غزل یا نظم کو ترنم میں پڑھنے کا رواج نہیں تھا، لیکن ساغر کو اس سے مستثنےٰ قرار دے دیا گیا اور جب وہ غزل پڑھ رہا تھا تو اس کے ترنم نے ہال کو سحر زدہ کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ساغر نے کون سی غزل پڑھی تھی۔ لیکن میرا احساس اس کے کھنکتے ہوئے ترنم سے اب بھی گنگنا اٹھتا ہے۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی بار سنا گیا اور ساغر کی غزل کو اربابِ حلقہ نے بے داغ قرار دیا۔ جب اس غزل کی تعریف ہو رہی تھی تو میں نے دیکھا وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور زمین کی طرف

دیکھ رہا تھا۔ حلقے کی میٹنگ کے بعد ہم گروپ کی صورت میں انار کلی آئے اور نظام ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے ساغر نے بتایا کہ اگلے مہینے لاہور کے S.P.S.K ہال (موری دروازہ کے باہر جہاں اب پولیس چوکی قائم ہوگئی ہے) طرحی مشاعرہ ہو رہا ہے اور اسے بھی دعوت دی گئی ہے۔

دوسرے روز ساغر واپس چلا گیا اور میں مہینے بعد ہونے والے مشاعرے کا انتظار کرنے لگا۔ اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی مرحوم نے بھی شرکت کرنا تھی۔ اس لیے لاہور کے شاعر ابھی سے طرح پر شعر کہنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جوں جوں مشاعرے کا دن قریب آرہا تھا حافظ امرتسری کی دکان پر طرحی غزلیں سنائی دینے لگی تھیں۔ استاد جیسے ناآدم نظامی دو تین دن پہلے لاہور میں اپنے شاگردوں سمیت آگئے تھے اور مشرقی ہوٹل پیسہ اخبار کے ایک کمرے میں اپنے شاگردوں کی طرحی غزلوں کی اصلاح کر رہے تھے۔ مرحوم علامہ لطیف انور کے شاگردوں کا الگ حلقہ تھا اور اندرون لوہاری دروازہ پنڈت میلا رام وفا کا بھی ایک اپنا حلقہ تھا۔ جن کے شاگردوں میں قمر جلال آبادی۔ گلشن جلال آبادی اور شوراج بہار ایسے ہندو نوجوان شاعر شامل تھے۔ ادب کی ایک ہی صنف سے تعلق رکھنے کے باوجود ہندو شاعر ادیب مسلمان شاعروں اور ادیبوں کے حلقوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور منطقی طور پر ان کا ایک الگ حلقہ تھا۔ لہٰذا S.P.S.K ہال میں ہونے والے طرحی مشاعرے میں واضح طور پر دو الگ الگ گروپ شرکت کر رہے تھے۔ ساغر لاہور میں آیا تو ادبی دوستوں سے ملنے سے پہلے اس نے مانسرور ہوٹل میں کمرہ لیا اور کپڑے بدل کر پیسہ اخبار میں آگیا۔ شام کو نظام ہوٹل میں ساغر نے چائے کے دور پر اپنی طرحی غزل سنائی خیال اور بندش کے اعتبار سے اس نے جن تخلیقی تجربوں کو شعروں کی زبان دی تھی ان پر رومانیت اور انقلابی ولولہ انگیزی چھائی ہوئی تھی اور دوسرے اس کے ترنم نے بہت سارے شاعروں کے حوصلوں کو پست کر دیا جو دل ہی

طرحی مشاعرہ لوٹ بھی چکے تھے۔

نظام ہوٹل سے اٹھ کر ساغر اور میں انار کلی سے ہوتے ہوئے تار گھر کی پچھلی سڑک پر آ گئے۔ اس نے جیب سے گولڈ فلیک کے سگرٹوں کا پیکٹ نکالا اور میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"یونس۔ میرا لاہور میں رہنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

"تو آ جاؤ نا۔" میری بات سُن کر اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا اور کہنے لگا۔ "آ تو جاؤں۔ پر آ کے کیا ہو گا، کیونکہ روزگار تو امرتسر سے وابستہ ہے۔" مانسرور ہوٹل تک ساغر اور میں بڑی باتیں کرتے رہے اور پھر اس کو کمرے میں چھوڑ کر میں گھر واپس آ رہا تھا تو مجھے اس کی مستی بھری آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی گہری سنجیدگی بہت یاد آتی رہی۔ عام شاعروں کی نسبت وہ زیادہ کھویا کھویا اور ٹھہرا ٹھہرا لگتا تھا جیسے کسی انجانی بات نے اسے بہت زیادہ حیرت زدہ کر دیا ہو۔

دوسرے روز مشاعرہ تھا اور وہ مجھے صبح ہی صبح لوہاری دروازے کے باہر مل گیا۔ اس کے ساتھ ایک ہندو شاعر تھا جس کا میں نام بھول گیا ہوں۔ دروازہ کے باہر جہاں اب مسلم مسجد ہے تانگوں کا لوہے کی چھتوں اور گارڈروں والا اڈہ ہوتا تھا۔ پان گلی کے ناکے پر سکھ کی دودھ دہی کی دکان ہوتی تھی۔ ہندو نوجوان نے اسے سکھ کی دکان سے دہی کی جھاگ دار لسی پلوائی اور اسے تانگے میں بٹھا کر لاہور کی سیر کروانے کا آرزو مند تھا۔ ساغر تانگے میں سوار ہونے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے لاہور کی سیر کا پروگرام ملتوی کر دیا اور ہم انار کلی کے کیلاش ہوٹل میں آ گئے۔ (کیلاش ہوٹل کی جگہ اب نعمت کدہ اور نعمت مارکیٹ بن چکی ہے) کیلاش ہوٹل صرف نام کا ہندو ہوٹل تھا۔ لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ہوٹل تھا اس لیے کہ اس میں ایک میکدہ بھی تھا اور سوا روپے میں جیم خانے کا

بڑا پیگ پینے کے لیے اُوپر گیلری میں بادہ کشوں کا مسلسل آنا جانا رہتا تھا۔
نیچے ہال میں بیٹھنے کی بجائے ساغر نے گیلری کی سیڑھیوں کی طرف قدم
بڑھایا تو میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر اس نے کہا۔
"کوئی بات نہیں، ذرا مے کشی کریں گے"۔
"لیکن شام کو مشاعرہ ہے اور تم"۔
اس نے میری بات کو کاٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔
"مشاعرے میں بھی جائیں گے پہلے ذرا مے کدے کو سلام کر لیں"۔
گیلری میں ہندو بیرے نے ہمیں دیکھا اور ہماری ٹیبل کو صاف
کر کے پوچھنے لگا۔ کیا لاؤں؟
"شراب"۔ ساغر کی آنکھوں کی مستی نے بیرے کو مسکرانے پر مجبور
کر دیا۔ بادہ نوشی کی اس قسم کی محفل میں مری موجودگی ایک نیا تجربہ تھی اور
میں ہیجان زدہ تھا۔ ساغر نے یکے بعد دیگرے دو تین پیگ پیے اور میں
نے دیکھا کہ اس کی مستی کے غلاف سے سنجیدگی باہر آگئی اور وہ زیادہ حیرت
زدہ دکھائی دینے لگا۔

کیلاش ہوٹل سے باہر نکلے تو اس کا ہندو دوست پان لے آیا۔ ساغر کا
سنہرا سانولا چہرہ دمک رہا تھا اور بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے کو
چوم رہی تھی۔ اس نے شیروانی کے بٹن کھول رکھے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ
کسی تانگے میں بیٹھ کر شہر کی سیر کی جائے، لیکن اس کا ہندو دوست ہمیں
ایک روڈ کے ایک وشنو ہوٹل میں لے آیا۔ یہاں روزنامہ اجیت کا
ایڈیٹر ہر بھگوان شاد اور ماہنامہ بیسویں صدی کے ایڈیٹر خوشتر گرامی بیٹھے
ہوئے تھے۔ انہوں نے ساغر کی بڑی شہرت سن رکھی تھی اور ہندو دوست
نے ساغر کا تعارف خوشتر گرامی سے کرایا تو وہ بزرگ کرسی سے اچھل کر
باہر آ گئے اور اسے سینے سے لگا کر بولے۔

"برخوردار" لیکن ساغر کو مے بھرے ہوئے دیکھ کر فوراً الگ ہو گئے ہر بھگوان شاد نے اپنا سینہ آگے کر دیا اور ساغر کے گلے لگ کر جھومنے لگا۔ رات کے مشاعرے کی باتیں ہونے لگیں۔ ہر بھگوان شاد سے میں پہلے کئی بار ہسپتال روڈ پر ہفت روزہ گورو گھنٹال کے دفتر میں مل چکا تھا۔ ہر بھگوان شاد بھی لاہور کا بڑا عاشق تھا۔ اور سیاسی اداریہ نویس ہونے کے باوجود اس نے لاہور پر بڑی پیاری نظمیں لکھی تھیں۔ ساغر سے لاہور کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے ساغر سے پوچھا۔

ساغر۔ تم نے لاہور کو کیسے دیکھا۔

ساغر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میں نے لاہور کو یونس ادیب میں دیکھا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اب لاہور یونس کا نہیں، میرا شہر بننے والا ہے۔ مجھے لاہور اور اپنے بارے میں ساغر کی رائے سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ دال بھات کھانے کے بعد ویشنو ہوٹل سے نکلے تو وہ ہندو دوست رات کو مشاعرے میں ملنے کا اقرار کر کے چلا گیا اور میں نے بھی چاہا کہ اب چلا جاؤں تاکہ رات کو مشاعرے میں آسکوں لیکن ساغر کی مرضی یہ نہیں تھی وہ چاہتا تھا کہ میں اب اس کے ساتھ ہی رہوں اور وہ کہنے لگا پردیسیوں کو یوں چھوڑ دینا بھی اچھی بات نہیں۔ ہم تو تیرے شہر میں پردیسی ہیں۔

شہر میں اور بھی اس کے جاننے والے بہت تھے لیکن نہ جانے وہ ان سے کیوں ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر ایک کیف ضرور طاری تھا۔ لیکن وہ بیدار تھا۔ اتنا بیدار کہ اس نے سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے سینکڑوں شعر سنائے۔ تحت اللفظ میں، ترنم میں اور اسی طرح سڑکوں پر چلتے چلتے شام ہو گئی۔ شام ہو گئی تو وہ بہت اداس اداس نظر آنے لگا۔

"کیا امرتسر یاد آرہا ہے"؟

نہیں۔ لیکن جب شام ہوتی ہے تو میں ویران سا ہو جاتا ہوں"۔ ساغر نے شیروانی کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہم دونوں چیئرنگ کراس سے پیدل چلتے ہوئے بڑے ڈاک خانے تک آئے تو اس وقت بڑے ڈاکخانے کی گھڑی آٹھ بجا رہی تھی۔ شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ ہم مشاعرے میں پہنچے تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ ساغر کو منتظمین نے سٹیج پر بلا لیا اور میں سامعین میں بیٹھ گیا۔

ساغر اپنا نام پکارا جانے پر اٹھا۔ مائیک پر آیا، لمحہ بھر کے لیے چُپ رہا کھنکھار کر بولا "غزل کا مطلع عرض ہے"۔

اس نے جادو کر دینے والے ترنم میں مطلع پڑھا تو ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ زخمیوں کی طرح تڑپ اٹھے۔ وہ غزل سنا کر جا رہا تھا تو ہال میں تالیوں کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ جگر مراد آبادی نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما۔ لوگ پُر اشتیاق آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن ساغر کے ہونٹوں پر جو ہلکی سی مسکراہٹ تھی" اس کے اندر کی سنجیدگی کو کم از کم مجھ سے نہ چھپا سکی۔ ساغر پر تحسین و آفرین کا کوئی ہیجان طاری نہیں تھا وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور ہر کوئی اس سے پوچھ رہا تھا "کہاں ٹھہرے ہوئے ہو اور کب جانے کا ارادہ ہے"۔

وہ آہستہ سے کہتا "بس یہیں کہیں ڈیرہ لگایا ہوا ہے اور واپسی کے بارے میں اللہ ہی جانے"۔ مشاعرے کے بعد بہت سارے لوگ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم لوہاری سے ایک تانگے میں بیٹھ کر مانسرور ہوٹل میں آ گئے۔ وہ بڑا چپ چپ تھا اور میں اس کی خاموشی سے اکتا کر جانے لگا تو اس نے روک لیا۔

"یہیں سو جاؤ"۔

"سو تو جاؤں۔ صرف ماں کا خیال آتا ہے وہ جاگتی رہے گی اور وسوسوں

میں ڈوبی رہے گی۔

ماں کے ذکر سے وہ اور زیادہ چپ ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کرے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

ماں کا خیال بھی ایک بہت بڑا موضوع ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ تمہاری ماں بھی تمہارے پاس ہی ہوگی۔

نہیں۔ پتا نہیں کہاں ہے۔

لیکن اس نے اپنی ماں کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور یہی کہتا رہا۔

"ماں کی محبت انسانوں کا مشترکہ جذبہ ہے۔

اس رات وہ شاعر ساغر صدیقی نہیں تھا کوئی فلاسفر لگتا تھا۔ جو مبہم چیزوں اَن دیکھی باتوں، اوجھل جذبوں اور عجیب وغریب سوچوں کے راز پانے کی فکر میں ہو۔ لیکن مجھے اپنے جیسے نوجوان سے اس قسم کی پیچیدہ اور نہ سمجھ آنے والی باتیں سن کر بڑی حیرانی ہوئی اور یہی حیرانی مجھے ساغر کو دیکھنے سننے اور سمجھنے پر مجبور کرتی رہی۔ رات کا کھانا بھی ہم نے نہیں کھایا تھا اور وہ کھانے سے اس قدر بے نیاز تھا کہ جب بھی بیرے نے سگریٹ لاکر دیے کھانے کا لمحہ بھر کے لیے خیال آیا اور اس نے کہا۔

اب کیا کھانا ہے۔ صبح دیکھا جائے۔ رات اسی طرح بیت گئی۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ میں اسے مانسرور ہوٹل کی بالکونی میں چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے بتایا کہ وہ ایک ہفتے تک لاہور میں رہے گا۔

اگلے روز مجھے نوکری کے سلسلے میں کہیں جانا تھا اور میں دوپہر کے بعد مانسرور ہوٹل میں گیا تو بیرے نے بتایا کہ ساغر صبح ہی صبح ہوٹل چھوڑ گیا تھا۔

ساغر صدیقی امرتسر چلا گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ حافظ امرتسری کے پتے پر ضرور خط لکھے گا۔ یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ امرتسر سے کوئی آتا تو کبھی پتا چلتا وہ دلی میں ہے اور کبھی انبالے میں۔ لیکن امرتسر سے اس کا ناطہ برابر

قائم تھا۔ اس کی باتیں یاد آتیں تو اس کی شخصیت کا رچاؤ اور بانکپن سامنے آجاتا۔ اس کا ترنم میری سماعت میں آنکھیں کھولنے لگتا اور اس کے شعروں کے مفہوم اور گہرے ہونے لگتے۔

میرا اس کے شعروں کے بارے یہ احساس تھا کہ اس کے شعروں میں تخلیق کی پاکیزگی ہوتی ہے اور وہ خیال کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسے خوشبو قریب آجاتی ہے۔ وہ بڑے انوکھے لیکن سچے جذبوں کو منتقل کرنے کی ماہرانہ ادا کا مالک ہے اور اپنے افکار میں چھپی حقیقتوں کو تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ جدا ہو گیا لیکن میں اس کے اس شعر میں پھنسا رہا۔

ہر راہ تیری راہ گذر جانتے ہوئے
سجدے قدم قدم پہ گزارے چلے گئے

وہ کون ہے اور یہ راہگذر کس کی ہے جس کے ہر موڑ پہ ساغر سجدہ ریز ہے؟ یہ سوال اُس عمر میں میرے لیے سمجھنا بہت مشکل تھا۔ میں اس کی دوستی کے جذبے کو پوری طرح سمجھتا تھا اور پریشان بھی تھا کہ عجیب دوست ہے کہ بتائے بغیر چلا گیا۔

۱۹۴۷ء برصغیر میں تاریخی تبدیلیوں کا سال ہے۔

لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھنے سے حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے۔ میں بیکار تو پہلے ہی تھا۔ میری ماں اور میرا بھائی مجھے لاہور سے میرٹھ لے آئے اور خود بمبئی چلے گئے لیکن چودہ اگست سے پہلے پہلے میرٹھ واپس آ گئے۔ چودہ اگست کا دن جہاں میرے لیے آزادی کا زندہ احساس لے کر طلوع ہوا وہاں یہ غم بھی جگر کو چھلنی کر رہا تھا کہ میں لاہور سے دور تھا اور لاہور کی سرزمین پر دوبارہ قدم رکھنے کی آرزو میں تڑپ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ غریب الوطنی کے احساس سے آشنا ہوا تھا اور جب ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو میں اجڑے ہوئے ویران اور جلے ہوئے لاہور میں پہنچا تو زندگی

کا ایک نیا پہلو میرے سامنے تھا۔ پناہ گزینوں کے لٹے پٹے قافلے چلے آ رہے مشرقی پنجاب اور خاص طور پر امرتسر سے آنے والے پناہ گزینوں سے میں نے جن جانے پہچانے دوستوں اور بزرگوں کے بارے میں پوچھا ان میں استاد عیسلے نا دم نظامی اور ساغر صدیقی دو ایسے نام خاصے معروف تھے۔ استاد عیسلے ناآدم نظامی امرتسر میں فساد کے دوران شہید ہو گئے تھے اور ساغر صدیقی کا کچھ پتا نہ تھا۔

شعر و ادب سے میری وابستگی کا جنوں مجھے ہر شام حافظ امرتسری کی دکان پر لے جاتا، یہاں ساغر تو نہ ملا، کچھ نئے دوست مل گئے۔ فدا شاہجہانپوری محوی مظفر نگری، نور لدھیانوی اور اکرام لدھیانوی کے ذریعے اور بھی ادیبوں اور شاعروں سے ایک دوستانہ تعلق کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۸ء طلوع ہو چکا تھا۔ پرانے رہن سہن کی جگہ ایک نئی طرز زندگی کی بنیاد بن رہی تھی۔ ادبی علمی حلقوں کی بھی تعمیر نو ہو رہی تھی۔ انار کلی میں اکرام لدھیانوی کے والد قبلہ برق رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹھک بھارت سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا ذریعہ بن گئی اور اپنے آپ ایک ادبی حلقہ وجود میں آ گیا۔ پیسہ اخبار میجسٹک ہوٹل اور نظام ہوٹل میں تمام دن گزر جاتا۔ انہی دنوں اچانک ساغر صدیقی انار کلی میں نظر آ گیا وہ بالکل پہلے جیسا ساغر تھا۔ وہی گھنگھریالے سیاہ بال وہی خوبصورت آنکھیں اور وہی دلکش فنکارانہ خدوخال، لیکن اپنے احساس میں بری طرح کسی زلزلے کی زد میں تھا۔ یوں تو بھارت سے ہر آنے والا سراسیمہ تھا لیکن ساغر کی مستی بھری آنکھوں میں سنجیدگی کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ اس سے باتیں ہوئیں تو اس کی باتوں میں ایک سچے پاکستانی کا دل پوری توانائی سے دھڑک رہا تھا، لیکن فرقہ وارانہ فسادات میں قتل و غارت کے مناظر کا اس پر شدید ردعمل ہوا تھا۔ تاہم وہ لاہور میں نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے بالکل تازہ دم تھا۔

تنقیدی مجلسوں اور مشاعروں میں ساغر کی غزلیں اور ترنم ایک نئے

آہنگ اور سوچ کے نئے انداز کی علامت بن گیا۔

زندگی کے جس سیاسی تجربے میں اس نے ۱۹۴۷ء کے بعد آنکھیں کھولی تھیں اس کے پس منظر میں اس کے ذاتی عقائد کے نقش بہت گہرے تھے۔ لیکن وہ گرد و پیش کی محرومیوں کے گہرے شعور کے ساتھ ایک سچے تخلیق کار کا فرض ادا کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے بھائی کے ساتھ دیو سماج روڈ (کچہری کے پیچھے) کے ایک ہوسٹل میں رہ رہا تھا۔ امرتسر میں اس کے روزگار کا ذریعہ شانہ سازی تھا۔ کیونکہ اس نے مشرقی پنجاب کے ہنروروں کے طبقے میں جنم لیا تھا۔ شاعر پیدائشی تھا اور امرتسر کے علمی ادبی ماحول میں اس کا شعری شعور نکھرا تھا۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد اس نے والہانہ انداز میں اپنی ذات کو شعری تخلیق کے لیے وقف کر دیا تھا۔

کراچی سے پشاور تک کے بڑے بڑے شہروں میں ہونے والے مشاعرے اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔ لاہور میں تقریباً دن کا زیادہ حصّہ میرا اسی کے ساتھ بسر ہوتا تھا۔ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل تک اور ایک محفل سے دوسری محفل تک ہم سب دوست ایک ساتھ ہوتے تھے۔ اس طرح پورا شہر ہمارا حلقہ احباب تھا۔ اور ساغر قد آور شاعروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کی مقبولیت کا باعث اس کے شعری ریاض کی سچائی اور اس کے شاعرانہ مزاج کا کھرا پن تھا۔ جس کے باعث روایت پسند حلقے اس لیے ناراض ہو گئے کہ مشاعروں میں وہ ساری داد سمیٹ کر لے جاتا تھا اور ترقی پسند اس لیے اسے تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ محب وطن شاعر تھا۔ اس کے تخلیقی ولولوں کا جادو تو نہ ٹوٹ سکا لیکن مشاعروں کے ٹھیکیدار اسے نظر انداز کرنے لگے۔ جس سے وہ اچھے خاصے معاوضے سے محروم کر دیا گیا۔ دوسرے شہروں سے دعوت نامے آتے تو اس کے رقیب شاعر دعوت نامہ اس تک نہ پہنچاتے۔ زیادہ اصرار کیا جاتا تو وہ یہ کہہ کر مجرمانہ

خاموشی اختیار کر لیتے کہ وہ لاابالی اور متلون مزاج شاعر ہے پتا نہیں کہاں ہے؟

میں افسانے لکھتے لکھتے ایک بنک میں ملازم ہو گیا اور ساغر کو اپنی اقتصادی بدحالی کی بنا پر بھائی کا گھر چھوڑ دینا پڑا۔ اب شام کو کبھی کبھی ملاقات ہونے لگی۔ اس نے ڈاکٹر برق رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹھک پر ڈیرہ لگا دیا، لیکن اتوار کو کسی نہ کسی ادبی محفل میں ضرور ملاقات ہو جاتی۔ ہم اس سے شعر سننے کے لیے رات گئے تک ممتاز ہوٹل میں بیٹھے رہتے۔ فدا شاہجہان پوری بمبئی کی فلمی دنیا سے آیا تھا اور اچھا فلمی ٹیکنیشن تھا۔ نعیم ہاشمی اور ساغر صدیقی نے مل کر پروگرام بنایا کہ پاکستان کا قومی ترانہ ابھی تک تخلیق نہیں ہوا لہٰذا ایسا ترانہ فلمایا جائے جو فلم کے اختتام پر ہر سینما میں دکھایا جائے۔

ساغر صدیقی نے ایک قومی جذبے کے تحت ایک ترانہ لکھا تھا جسے فلمانے کے لیے فدا شاہجہانپوری نے جو انتظامات فراہم کیے وہ خاصے مایوس کن تھے۔ فدا خود لٹ پٹا کر بمبئی سے آیا تھا۔ ساغر تو ویسے ہی بے گھر تھا اور نعیم ہاشمی کے مالی حالات بھی دگرگوں تھے لیکن ان تینوں محب وطن شاعروں نے کسی نہ کسی طرح ترانہ فلما ہی لیا اور جب پہلی مرتبہ ریجنٹ سینما میں اسے دکھایا گیا تو قومی پرچم پر ساغر صدیقی کی آواز میں اس کا ہی لکھا ہوا ترانہ "سلام اے قائد اعظم" فلم کے اختتام پہ قومی پرچم کے احترام کی علامت بن گیا۔

ساغر صدیقی نے ترانہ لکھ کر نئی مملکت پاکستان کے ساتھ کروڑوں عوام کی نظریاتی وابستگی کو نئی زندگی اور نیا دلولہ دیا تھا۔ اور کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں نے ساغر صدیقی کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا تھا، لیکن ساغر صدیقی نے قوم پرست فنکار کی حیثیت سے اسے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ قومی ترانے کی فلم کی کامیاب تکمیل کے بعد اس نے کشمیر کے موضوع پر آزادی پسندوں کی جدوجہد کو فلمبند کرنے کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔

تینوں ساتھی بڑے پُرجوش تھے اس سلسلے میں ساغؔر مظفرآباد کے ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے گیا تو اسے آزاد کشمیر کے سرکردہ احباب نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے لیے فنانس کی ضرورت تھی اور فنانس آزاد کشمیر کے برسرِ اقتدار لوگوں نے مہیا کرنا تھا لیکن کئی دنوں اور مہینوں کی محنت کے باوجود فنانس حاصل نہ کر سکے لیکن کسی نہ کسی طرح انقلاب کشمیر کے نام سے ایک مختصر فلم بن ہی گئی۔ اس دوران ساغؔر ہفت روزہ تصویر کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اس کا دفتر پرانی میوہ منڈی میں تھا۔ ساغؔر کی ادارت میں فلمی ادبی ہفت روزہ بہت جلد مقبول ہو گیا اور اسے ساغؔر کے تمام ادیب شاعر دوستوں کا تعاون حاصل تھا۔ وہ صبح ہی صبح دفتر چلا جاتا اور رات گئے تک کام کرتا۔ اس دوران شعر اس پر نازل ہوتے رہے اور ہمعصر شاعروں کی مخالفت کے باوجود اس کے بغیر ہر مشاعرہ بے جان ہوتا تھا۔ ہفت روزہ تصویر اچانک بند ہو گیا اور ساغؔر نے ہمت کر کے اپنے نام سے ہفت روزہ فلمی اخبار کا ڈیکلریشن لے 'یا۔ اس اخبار کا دفتر اس کے بیگ میں تھا اور بیگ میں نامکمل فنانس اور دوستوں کے وعدے تھے۔ اس نے پتا نہیں فلمی اخبار کے دو تین شمارے کس طرح چھاپے اور اس کے بعد جھنجھلا کر اس نے فلمی اخبار کا منصوبہ دل سے نکال دیا لیکن اس صدمے کو نہ بھلا سکا جیسے اس نے ہر طرف سے مایوس کر دیا تھا۔ اور اس کی بدحالی کے سبب غلام جیلانی نیازی نے ۵ روپے میں اس کا ڈیکلریشن خرید لیا۔ لاہور میں اس کے لیے کام کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور جس شہر میں رہنے کے وہ خواب دیکھتا تھا اس میں اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اِکا دُکا مشاعروں میں جانے سے جو کچھ ملتا وہ اتنا حقیر ہوتا کہ اس سے ایک دن بھی مشکل سے گزرتا۔ پرانے کپڑے کئی لانڈریوں میں خود بخود ضبط ہوتے گئے اور کبھی ڈاکٹر برقؔ رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹھک پر پرانی قمیض دھو کر اس کے سوکھنے کے انتظار میں بیٹھا

ہوتا تو دل کو ٹھیس سی لگتی۔ بدترین اقتصادی بدحالی کا شکار ہوتے ہوئے بھی وہ مایوس نہیں تھا۔ کھانے کی تلاش میں نکلنے کی بجائے اس کا ذہن خوبصورت لفظوں کے پیکر تراش رہا ہوتا۔ وہ شعروں کے الہام میں ہمیشہ مسرور رہا۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد پاکستانی معاشرے کو جعلی کلیموں کے کاروبار نے جرائم پیشہ بنا دیا تھا اور متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ میں ہر فرد شریک ہو گیا تھا۔ نئی ملازمتوں نئے عہدوں اور ذاتی ترقی کی ہوس میں مبتلا افراد ایک دوسرے سے غافل ہوتے گئے اور اس افراتفری میں ساغر صرف حیرت زدہ تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کے نظریات انتہائی پاکیزہ اور بلند تھے۔

اس کے ملنے والے اس سے کام کرنے کے لیے کہتے تو وہ جواب دیتا، کیا میں جعلی کلیموں کا کاروبار شروع کر دوں۔ جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہوں اس سے غافل نہیں ہوں

ساغر کا کام شعر کہنا تھا اور اس کام کو وہ بہادروں کی طرح کر رہا تھا۔ وہ معاشرے کے گہرے شعور کے ساتھ تخلیقِ فن میں مگن تھا۔ اتنا مگن کہ اسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا۔ بابا عالم سیاہ پوش اور حفیظ قندھاری سے دوستی نے اسے مدہوشی سے لذت آشنا کر دیا۔ اس معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے مدہوشی ساغر کے لیے بہت ضروری تھی۔ اس کی راہیں بند تھیں اس کے گرد محرومیوں کا جال تنگ ہوتا جا رہا تھا اور زندگی کی جس سچائی کا وہ مبلغ تھا وہ اسے کہیں بھی نظر نہ آتی تھی اور جن بے حسی کی دیواروں میں گھرا ہوا تھا انہیں توڑنے کے لیے اس کے پاس صرف احساس کا ہتھیار تھا، جسے تیز اور صیقل کرنے کے لیے وہ مدہوشی کے گنگناتے بادلوں سے گہری دوستی کر چکا تھا۔ ان دنوں اس کی غزلیں

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

اور

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں
کل جنہیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

یہ اشعار ساغر کے مشاہداتی تجربوں کی شاعرانہ صورت بن کر سننے والوں کے احساس کا حصّہ بن گئے تھے۔ معاشرہ جس سیاہ رات کے مسافر کی طرح اس کے سامنے تھا، ساغر اسے اپنے شعروں میں نہ صرف دکھا رہا تھا بلکہ یہ احساس و شعور بیدار کر رہا تھا کہ

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

پاکستانی معاشرہ جس سیاسی اور اقتصادی نظام کی زنجیروں میں جکڑا جا رہا تھا ساغر اس کی حقیقت کو دیکھ رہا تھا اور اس کے انقلابی شعور کی روشنی اس کے شعروں کے ذریعے ذہنوں میں منتقل ہو رہی تھی لیکن اس کے انقلابی ذہن کو کھلنے کے لیے اسے معاشی تحفظ سے محروم کر دیا گیا اور جتنا وہ اپنی ذات میں سمٹتا گیا اتنا ہی لوگوں سے دُور ہوتا گیا۔

ساغر کی یہ تنہائی معاشرے سے اس کی پہلی بغاوت تھی لیکن اپنی ذات سے اس کا یہ پہلا عہد تھا۔ ایک وفا شناس انسان کا عہد جس نے اسے غلیظ خواہشوں اور خود غرض جذبوں میں لپٹے ہوئے لوگوں کی سوسائٹی سے بالکل الگ تھلگ کر دیا بظاہر یہ زندگی سے فرار حاصل کرنے والوں کا رویہ تھا۔ لیکن باطن میں ساغر اپنی حقیقی تکمیل کے پروسس میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے اندر جتنا جھانکتا چلا گیا اتنا

ہی اس دنیا سے دُور ہوتا گیا۔ وہ اپنے باطنی احوال میں مطمئن اور مسرور تھا لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے مغموم تھا۔ اس کی شاعری میں یاسیت کا بہاؤ اس معاشرے کی یاسیت تھی جس میں وہ زندہ تھا اور معاشرے نے سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے اس سے معاشرتی و سماجی رشتے منقطع کر لیے تھے۔ لوگ اُسے روایتی شاعر سمجھ کر اپنی رائے مکمل سمجھ لیتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ شاعر کو جس حقیقت الوہیت سے آشنائی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے وہ اسے اپنے قریب لانے کے لیے اسے سب سے دُور کر رہی ہے۔

ساغر زیادہ گم صم رہنے لگا تھا۔ جہاں اس کا دل چاہتا سو جاتا اور جہاں بیٹھنا چاہتا اس طرح بیٹھ جاتا جیسے ابھی اٹھ کر چلا جائے گا۔ وہ اپنے لیے فقیر کا لفظ استعمال کرنے لگا۔

فقیر نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔

فقیر کا دل بہت اداس ہے۔

فقیر راولپنڈی جا رہا ہے۔

وہ انتہائی تنگدستی کی حالت میں کسی ملنے والے یا دوست سے کچھ مانگ لیتا تو وہ پہلے تو ساغر کے لیے شیخ سعدی بن جاتا کہ کوئی کام کرو۔ اگر شاعری میں گزارہ نہیں ہوتا تو کنگھیاں بنانے لگو۔ یہ تو تمہارا پیشہ ہے اس کے بعد وہ دوسروں کو حقارت آمیز لہجے میں ساغر کے بارے میں بتاتا کہ پاگل ہو گیا ہے۔ ساغر سب کچھ سنتا تھا اور چپ رہتا تھا۔ لوگ زیادہ باتیں کرنے لگتے تو وہ دکھی ہو کر کہتا۔

"اچھا۔ اللہ بھلا کرے میں تو فقیر ہوں۔"

رات کو لاہور کی سڑکوں پر ساغر کے ساتھ گھومتے ہوئے میں اس خیال سے پریشان بھی ہو جاتا کہ جس قسم کی باتیں ساغر کے بارے میں کی جاتی ہیں، انہیں میرے بھی کردار میں شامل کر لیا گیا ہے، لیکن میں ساغر کی رفاقت نہ چھوڑ سکا۔ اس کی آنکھیں اداسیوں کے سلگتے الاؤ بن رہی تھیں اور ان سے حیرت کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔

پہلے تو وہ اپنی ذات کو الگ تھلگ کرنے کے عمل سے گزر رہا تھا اور اب اپنی ذات کے شعور سے عاری ہونے کے تجربے میں داخل ہو گیا تھا۔ مدہوشی اور مسلسل مدہوشی نے اس سے اس کی تمام انسانی صفات چھین لیں۔ اس نے باتیں کرنا بند کر دیں اور اپنی زندگی کو ٹکسالی دروازے کے باہر ویام شالہ کے پیچھے رحم سائیں کے تکیے کے لیے وقف کر دیا۔ جہاں وہ صبح شام پڑا رہتا۔ رحم سائیں کے تکیے میں اگر اس کو کچھ کھانے کے لیے مل جاتا تو کھا لیتا ورنہ رات اسی طرح گزر جاتی۔ اب میں اسے ملنے کے لیے ہر شام رحم سائیں کے تکیے میں جا رہا تھا۔ جس کا "مہذب دنیا" والے نفرت اور حقارت سے نام لیتے تھے۔ رحم سائیں ساغر سے بڑی محبت کرتا تھا اور تکیے میں آنے والا ہر شخص اس کی خاموشی اور حیرت زدہ آنکھوں کی گہرائی سے متاثر تھا۔ اس کی باتوں میں مایوسی نہیں تھی اور نہ ہی اس ذلت اور رسوائی کا اسے احساس تھا۔ وہ ملال اور رنج کے نئے تصور کو نکھار رہا تھا۔

ٹکسالی دروازے کے باہر ایک شام ہم دونوں گھوم رہے تھے کہ مرحوم موسیقار مبارک علی خاں حضرت داتا صاحبؒ کے مزار پر سلام کر کے جا رہا تھا کہ اس نے مجھے اور ساغر کو دیکھ لیا۔ اسے ساغر کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا اور حساس فنکار بظاہر گم ہونے والے شاعر ساغر صدیقی کو زبردستی اپنی بیٹھک پر لے آیا۔ جہاں ہم نے ایک دوسرے سے بڑی باتیں کیں اور ساغر کو رحم سائیں کا تکیہ چھوڑنے پر آمادہ کر لیا۔ ساغر نے مبارک علی کی بیٹھک میں رہنا شروع کر دیا۔ یہ بیٹھک شاہی محلے میں نوگزہ پیر کے سامنے تھی اور وہاں ہر وقت فنکاروں اور فن پرستوں کی محفل سی جمی رہتی تھی۔ اس نئے ماحول میں ساغر کو دیکھ کر ساغر کے مداح مطمئن سے نظر آنے لگے تھے۔ ان دنوں مبارک علی خاں انور کمال پاشا کی فلم دو آنسو کا میوزک ترتیب دے رہا تھا اور کسی اور شاعر کے لکھے ہوئے گیت کا مکھڑا سر دل میں سمٹ نہیں رہا تھا۔ اس مکھڑے سے نہ تو مبارک علی مطمئن تھا اور نہ ہی انور کمال پاشا۔ دوسرے روز مبارک علی نے ساغر سے ڈرتے ڈرتے مکھڑا لکھنے

کے لیے کہا، کیونکہ مبارک علی خاں اسے اپنے ہاں اس ذاتی معاہدے کے ساتھ لایا تھا کہ اس پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ساغر نے فوراً ایک مکھڑا لکھا اور دھن مبارک علی کے ذہن میں اتر آئی۔ انور کمال پاشا نے مکھڑا سنا تو ساغر سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔ اور انور کمال پاشا نے اسی سے گیت لکھوانے کا فیصلہ کر لیا۔ ساغر کو پانچسو روپے ایڈوانس ملے تو مبارک علی نے خود اس کے لیے کپڑے خریدے ایک گھڑی لے کر دی۔ نیا جوتا خریدا اور باقی روپے اس کی جیب میں ڈال دیئے۔ شام کو ساغر صدیقی بیٹھک سے اتر کر نیچے آیا تو اس کے قدم اسے رحم سائیں کے تکیے میں لے گئے۔ یہاں اس نے سارے پیسے بانٹ دیئے اور بے خود و سرشار ہو کر بیٹھک پر آیا تو مبارک علی اور میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگا۔

آج فقیر بہت خوش ہے۔

مبارک علی کو اس بات کا بڑا رنج ہوا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ساغر اوپر سونے کے لیے چلا گیا۔ مبارک علی نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"اگر میں نے اس سے پوچھا تو وہ بیٹھک پر آنا چھوڑ دے گا۔"

"کہنا بھی نہ خانصاحب۔ وہ تنقید ہی سے تو گھبراتا ہے۔"

میری بات سُن کر مبارک علی خاموش ہوگیا اور میں ساغر سے ملنے چھت پر گیا تو وہ ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔

ساغر نے گیت مکمل کیے تو انور کمال پاشا نے اسے مزید پانچسو روپے دیئے اور ساغر نے نوٹ انور کمال پاشا کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

"اتنے سارے نوٹ میں کہاں رکھوں گا۔ انہیں اپنے پاس ہی رکھیں۔ میں پانچ روپے روز لینے آجایا کروں گا۔"

ساغر جتنا دنیا سے دور رہنا چاہتا تھا۔ دنیا اتنے ہی اس کے گرد سنہری جال بن رہی تھی۔ مبارک علی خاں نے ساغر کے گیت کی دھن ریکارڈ کرائی تو تنویر نقوی

نے ساغر کو سینے سے لگا لیا اور باقی تمام فلمی شاعروں کے سینے حسد کی آگ میں جل اٹھے۔ لیکن شہرت اور دولت بھی ساغر کے باطنی سفر کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ وہ جس سمت تیزی کے ساتھ جا رہا تھا وہ عام دیکھنے والوں کی نگاہوں میں بے ثمر منزل تھی۔ وہ فلمی دنیا کی جھوٹی چمک دمک سے گھبرا کر پھر سوگوار صبحوں اور غم افروز شاموں کے آنگن میں آگیا۔ اس نے معاشرتی ذلت و رسوائی کے سارے غم اپنے دل میں چھپا لیے اور ملامت کا لباس پہن کر عزت و توقیر کے فرسودہ نظام کے سامنے باغی بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے معاشرے سے اپنی حق تلفی کا انتقام خود فراموشی کے ہتھیاروں سے لیا اور غم کی سیاہی اس کا لباس بن گئی۔ دنیا دیکھ رہی تھی کہ وہ دنیا کے شعور سے بیگانہ ہو گیا ہے، لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے سب کچھ کھو کر انجانی بصیرت مل رہی ہے۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے پیر تپتی ہوئی سڑکوں پر چلتے چلتے بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گئے تھے۔ لمبے بال الجھتے جا رہے تھے اس کی سنہری سانولی رنگت جل سی گئی تھی اور بڑی بڑی مست مست آنکھیں دُور دُور تک دیکھنے کے زاویے بن گئی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا دیکھ رہا تھا کہ اس سے ملاقاتیں بہت مختصر ہوتی گئیں وہ سڑکوں پر کم کم دکھائی دیتا۔ سیاہ چادر اوڑھے وہ کوئی بات کہہ کر گزر جاتا اور کبھی پہچاننے سے انکار کر دیتا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت چمڑے کی طرح کسا جا رہا تھا۔ کبھی اس کے جسم پر کوئی پھوڑا نکل آتا اور کبھی اس کے زخمی پیر سے پیپ بہنے لگتی اور وہ داتا دربار کے عقب میں کھڑکھڑی پیر کے مزار کی چاردیواری کے اندر خود کو مقید کر لیتا۔ میں حفیظ قندھاری اور اکرام لدھیانوی اسے ملنے جاتے تو وہ منہ دوسری طرف پھیر کر بڑبڑانے لگتا۔ اس کی بے ربط باتیں کبھی سمجھ آتیں اور کبھی معمہ بن جاتیں۔ اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ شاعر ہے اور اس کا نام ساغر صدیقی ہے۔ ہم پرانی دوستی کا واسطہ دے کر علاج پر زور دیتے تو وہ بڑے اطمینان سے کہتا "اللہ وارث ہے۔ آزمائش بہت بڑی ہے۔"

کبھی کبھی رات کو وہ داتا حضورؒ کے مزار کے آس پاس کھڑا نظر آتا۔ کبھی چلنے لگتا اور تھوڑی دور جا کر واپس آ کر گنبد کی طرف دیکھنے لگتا۔ برسوں تک وہ اسی حالت میں رہا۔ علمی ادبی دنیا تقریباً اسے بھول گئی تھی اور پرانی یادوں کے حوالے سے اگر کہیں کوئی بات ہوتی تو ساغر کے متعلق یہ کہہ کر بات ختم کر دی جاتی کہ اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔

ساغر تباہ ہو رہا تھا یا بن رہا تھا یہ بات نہیں تھی۔ ساغر آزمائش کی گردش میں تھا۔ شہر میں اسے جاننے والے پاگل کہنے لگے تھے اور جو نہیں جانتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک تباہ حال گداگر تھا۔ میں خود کبھی کبھی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ شاعر ساغر مر چکا ہے اور ایک فاتر العقل انسان زندہ ہے، لیکن ایک اور خیال اس وسوسے کو رد کر دیتا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو بے پایاں تخلیقی صلاحیتیں بخشی ہیں انہیں کیسے چھین سکتا ہے۔ اکثر داتا حضورؒ کے مزار کے عقب میں ملنگوں کے ڈیرے پر اس سے ملاقات ہوتی تو یوں لگتا جیسے ان دیکھی چیزیں دیکھ رہا ہے اور ان کے بارے میں اظہار کرتے وقت اس کا انداز سراسر اشاراتی ہوتا۔ ملنگوں اور تارک الدنیا لوگوں کے ماحول میں وہ بے نام و نشان زندہ تھا اور اس طرح اپنے آپ کو بے نام و نشان کرنے کا حوصلہ صرف ساغر میں تھا۔ اس کے خوبصورت بال جوگیوں کی لٹوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں سکڑتی جا رہی تھیں اور چہرے کی جلد خاکستر ہو گئی تھی۔

علم و ادب کے اجارہ دار اسے فراموش کر بیٹھے تھے اور اس کی بصیرت کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے میں انہوں نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے ہمعصر اس کی عارضی گمشدگی کو غنیمت جان کر مطمئن ہو گئے تھے۔ شعر و ادب کے نام پر شہرت و دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے اور ساغر صرف سانس کی آمد و رفت سے زندہ دکھائی دیتا تھا۔

میں اکیلا ہوتا تو کھڑکھڑی پیر کے قریبی کھیتوں میں میرے ساتھ آ جاتا۔ اس

کی باتوں سے گرنے والے حسرت و یاس کے شعلے آس پاس پھیل جاتے۔ وہ دنیا سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ سے غافل ہو کر اپنے اندر جھانکتے جھانکتے بہت دور چلا گیا تھا۔ اور وہ خود کہتا تھا اللہ ہی وارث ہے۔ پتا نہیں منزل کونسی ہے۔ حواس گم ہیں۔ ایک نہ سنائی دینے والی گونج میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ اور میں جیسے خدا کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔ شاید خدا کا یہی مقصد ہے۔ میں رات کو داتا حضورؒ کی گلیوں میں گھومتا ہوں تو یہ بات میرے احساس کو فروزاں کر دیتی ہے کہ مدینے کی گلیوں میں پھر رہا ہوں۔

ساغر کا یہ احساساتی مشاہدہ ان لوگوں کے لیے حد سے زیادہ بے خودی و مستی کا نتیجہ تھا جو زندگی میں صرف آسائشوں کے تمنائی ہوتے ہیں، لیکن ساغر کا یہ مشاہدہ ایک روحانی تجربہ تھا کیونکہ اسے اعلیٰ وجدان اور ادراک کے ساتھ تخلیق کیا گیا تھا۔ اس کے سامنے لفظ عریاں تھے اور زندگی نے جو کچھ اسے دیا تھا وہ غم تھا اور وہ غم آشنا اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ زندگی کی حقیقت قریب سے نہ صرف دیکھ لے بلکہ اسے اپنے شعور و احساس کا حصہ بنا لے۔ ساغر نے غم کی امانت کو جوانمردوں کی طرح قبول کیا اور اس نے ان لوگوں کی دنیا سے دامن کھینچ لیا۔ جو ایک دوسرے کو لوٹنے میں اتنے بے رحم ہو گئے تھے کہ خود اپنے ہاتھوں بھی مر رہے تھے۔ زندگی کے معنے ان کے لیے گونگے تھے اور خدا جس انسان کو زندگی کے معنے سمجھا رہا تھا اس کو دیکھنے کے لیے ان کے پاس آنکھیں نہیں تھیں۔

ساغر کی پوری زندگی میرے ذہن میں متحرک مناظر کی طرح ہے اور میں اپنے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ کہوں گا کہ ساغر ابتدا ہی سے ایک صوفیانہ رویہ تیزی سے ابھار رہا تھا اور اس کا یہ سارا عمل غیر اختیاری تھا۔ اس میں کوئی بناوٹ نہ تھی اور جس زخمی احساس کے ساتھ اس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا، وہ فطری تھا اور اگر وہ غم شناس نہ ہوتا تو شاید وہ اس ذلت و

رسوائی کو برداشت کرنے کی کوشش میں ہی ہلاک ہو جاتا جو اسے زندگی کی صورت میں ملی تھی۔ اپنے بیگانے اس کی صورت دیکھنے سے بیزار ہو گئے اور دامن بچا کر گزر جاتے۔ اس کی فقیرانہ زندگی دوسروں کے نزدیک طعنہ تھی، لیکن جس شعور کے ساتھ اس نے زندگی کے فانی ہونے کا مشاہدہ گیا تھا اسی شعور کے ساتھ وہ حقیقت اُلوہی کا ادراک کرنا چاہتا تھا، لیکن نہیں جانتا تھا کہ یہ شعور ہی حقیقت اُلوہی کے ادراک میں سب سے بڑا پردہ ہے۔ حقیقت اُلوہی نے اسے اپنا بھید دینے کے لیے خود ہی اس کے شعور اور بصیرت کو سلب کر لیا اور دنیا کی نگاہوں میں اسے حقیر ترین بنا دیا۔ دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ساغر کا نحیف و نزار، لرزاں ترساں جسم اور ایک تہس نہس شعور تھا لیکن باطن میں وہ جس ابدی روشنی کو جھانکتے ہوئے دیکھ رہا تھا، وہ اتنی جمال آفریں تھی کہ ساغر گردوپیش سے بالکل ہی بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو فنا کے سپرد کر کے فارغ ہو گیا تھا۔

یہ ایک بڑا ہی خوفناک تجربہ تھا اور یوں ایک تخلیق کار کا رنگ و نغمہ کی دنیا سے کنارہ کش ہو جانا عام ذہنوں کے لیے خودکشی کے مترادف تھا اور اس پر بزدل ہونے کے بھی تیر چلائے جا رہے تھے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کا سامنا نہ کر سکا، لیکن جس حقیقت کے رُوبرُو ہونے کا سفر اس نے اختیار کیا تھا اس کی معنوی صداقت طمع، خوف اور لالچ کے مارے ہوئے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

یہ سفر اپنے آپ کو مٹا دینے کی حالت کی علامت ہے جس میں شعور اور بصیرت تک چھین لی جاتی ہے اور انسان مسلسل ایک کرب اور پُر ملال افسوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اسی افسوں میں گم وہ کبھی کبھار سڑکوں پر چلتا ہوا دکھائی دیتا تھا تو لوگ اسے دنیا کا حقیر ترین اور قابلِ رحم شخص سمجھ کر اس پر ترس کھانے لگتے۔ جاننے والوں کے دل ہمدردی سے بھر جاتے لیکن وہ رحم، ہمدردی اور محبت کے جذبات سے بالکل بے نیاز تھا جو لوگ اس کے

پاس غمخواری کے لیے آتے ساغر کے کرب و ملال میں اضافہ کر کے چلے جاتے اور وہ کھڑ کھڑی پیر کے مزار سے اُٹھ کر کھیتوں میں نکل جاتا۔

ساغر ان وارفتہ کیفیتوں کے جنگل میں کئی سال رہا اور اسے زندہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی۔ شدید بیمار ہو جاتا تو کچھ عرصہ بعد خود بخود ٹھیک ہو جاتا۔ اس نے خطرناک سے خطرناک بیماری میں بھی کسی چارہ گر کو تلاش نہ کیا۔ ہر موسم کی سختی میں زندگی کی ہر سہولت سے خود کو محروم کر کے اس کا زندہ رہنا ایک معجزہ دکھائی دیتا تھا۔

ساغر مسلسل کئی سالوں تک داتا حضورؒ کے مزار کے اردگرد ہی گردش کرتا رہا۔ اس دوران میں نے کبھی اسے کچھ لکھتے ہوئے نہ دیکھا اور نہ ہی اس کے پاس کاغذ قلم ہوتا تھا۔ جس قسم کی باتیں کرتا ان میں سے میرے لیے کوئی مفہوم اخذ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے سامنے نہ ماضی تھا نہ حال اور نہ مستقبل۔ الجھی الجھی مبہم اور اشاراتی باتیں۔ میں گھر آ کر اس کی باتیں نوٹ کرنا چاہتا تو کچھ یاد نہ رہتا کہ ساغر نے کیا کہا تھا۔

۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور شہر میں فوجی جیپیں گھومنے لگیں تو ساغر ذہنی گمشدگی کی حالت میں ہی باہر آ گیا۔ میں نے اسے برسوں کے بعد لوہاری دروازے کے چوک میں نعمت کدے کے سامنے کھڑے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے میرے ساتھ اکرام لدھیانوی کو بھی پہچان لیا۔ میں نے سب سے پہلے یہی پوچھا۔

"یہاں کیسے آ گئے"

"منزل کی تلاش میں۔ اس نے بے نیازی سے کہا اور پوچھنے لگا۔"

"تم کیا کر رہے ہو"

"فلمی ستارہ کے نام سے ایک پرچہ نکال رہا ہوں۔ آؤ کہیں چائے پیتے ہیں"

ساغر مان گیا اور ہم اسے ممتاز ہوٹل تک لانے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہ

یہ کہہ کر ایک طرف چل دیا۔

"زندگی ایک حسین لٹیرا ہے۔ اس سے بچنا ہی فراست ہے"۔

اکرام نے کہا۔ "پاگل ہوگیا ہے"۔

میں نے کہا۔ نہیں آؤ ذرا اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ دیکھیں کہاں جاتا ہے؟

لیکن اکرام نہ مانا اور ساغر انارکلی کے ہجوم میں کھو گیا۔

اس کے بعد ساغر اسی گمشدگی کے عالم میں جب بھی نظر آیا اس کے جسم پر چیتھڑے ہوتے اور وہ ملنے جلنے والوں سے پیسے مانگ رہا ہوتا۔ کچھ لوگ دے کر خاموش ہو جاتے اور باقی اپنی فیاضی کے افسانے دوسروں کو سناتے۔ ساغر سب کچھ سُن کر ہنس دیتا اور کہتا۔

"یہ کیا جانیں کہ فقیر کس آزمائش کے موڑ پر کھڑا ہے اور جب کچھ لوگوں نے میری حفاظت کے نام پر میرا حصہ کھا لیا ہے تو فقیر ہاتھ نہ پھیلائے تو کیا کرے"۔

جاننے والے چونی دینے سے پہلے شعر سننے کی فرمائش کرتے تو وہ دکھی ہو کر کہتا "زمانہ ہمدردی کر کے معاوضہ وصول کرنے کا عادی ہو گیا ہے اور فقیر کو کچھ یاد نہیں"۔

اس کے ساتھ ایک دو ساتھی رہنے لگے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں والے تباہ حال شخص اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ جہاں وہ رک جاتا وہ بھی کھڑے ہو جاتے اور گداگری کرنے سے جو کچھ اس کے پاس ہوتا وہ اسی میں سے کھاتے اور چلے جاتے۔ ساغر خالی ہاتھ رات بسر کرنے کا غم لے کر فٹ پاتھوں پر چلنے لگتا۔ دن کو باغوں اور ویران جگہوں پر گزارتا۔ شام سے کچھ پہلے لوہاری سے بھاٹی تک کا چکر لگاتا۔ کوئی باتیں کرنے کے لیے روک لیتا تو ساغر پیچھا چھڑا کر بھاگ جاتا۔ وہ اب زیادہ ہی خود کلامی کرنے لگا تھا اور خود فراموشی اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ مشاعروں میں اب بھی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی لیکن وہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ اس کی مملکت سرکلر روڈ تھی اور ہر فٹ پاتھ اس

کا پایۂ تخت تھا۔

لوگ کہتے تھے وہ ایک زندہ لاش ہے۔ لیکن اپنی مسلسل فنا میں اس نے جو کچھ پایا وہ اس سے بھی پوشیدہ تھا اور دوسروں کی نگاہوں سے بھی۔ ہم سب اس کی ظاہری حالت سے اس کے بارے میں اندازے لگاتے تھے کہ ساغر دیوانہ ہے۔ اپنے آپ میں نہیں رہا، لیکن وہ کسقدر اپنے آپ میں تھا؟ اس کا حقیقی اندازہ اس وقت ہوا جب اس نے چلتے چلتے سڑک پر سے گرا ہوا ایک کاغذ اٹھایا اسے جھاڑا صاف کیا اور تہ کر کے مٹھی میں پکڑ لیا۔ چند دنوں بعد میں سرکلر روڈ پہ جا رہا تھا کہ مجھے ساغر کی آواز سنائی دی۔ ساغر نے بہت سالوں بعد مجھے خود آواز دی تھی۔ میں پلٹ کر اس کی طرف بڑھا تو وہ مجھے اخبار مارکیٹ میں لے گیا۔ میرے سامنے ایک نیا ساغر صدیقی تھا۔ اخبار مارکیٹ کے ایک شکستہ برآمدے میں اس نے سگریٹ میرے سامنے رکھ دیے اور کہنے لگا۔

"آپ بیٹھیں۔ میں چائے لاتا ہوں"۔

ساغر میں یہ تبدیلی میرے لئے حیرت انگیز تھی۔ اتنے میں شبیر بجلی والا آ گیا اور کہنے لگا، ساغر صاحب کہاں ہیں؟

چائے لینے گئے ہیں۔

"چائے کے لیے تو میں کہہ کر آیا ہوں"، شبیر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ملاقات کا وقت طے تھا؟"

شبیر نے جواب دیا۔ "ہاں کل رات ساغر صاحب نے کہا تھا کہ میں کل سے اخبار مارکیٹ میں رہوں گا"۔

ساغر کا یہ فیصلہ بھی حیران کن نہ تھا۔ شبیر بجلی والا بھی خوب شخص تھا۔ ہمارے پرانے ساتھیوں میں سے تھا اور بجلی کا کام کرنے کی بجائے بجلی کے فلسفے پر زیادہ گفتگو کیا کرتا تھا لیکن انتہائی مخلص اور خدمت گزار دوست تھا۔ ساغر سے پرانی عقیدت نے اسے کھڑ کھڑی پیر اور رحم سائیں کے تکیے

میں بھی ساغر کے ساتھ رکھا تھا اور ساغر کے آنے تک ہم اسی کی باتیں کرتے رہے۔ شبیر کی عقیدت نے ساغر کو درویش کے پیکر میں ڈھال لیا ہوا تھا لیکن وہ ساغر کو ہمیشہ دنیا میں واپس کھینچ کر لانے کی جدوجہد سے کبھی باز نہ آیا۔ اگرچہ وہ خود دنیا میں رہتے ہوئے دنیا میں نہیں تھا۔ تاہم ساغر کے بارے میں اس کا رویہ بڑا صحت مند تھا۔ ہم کافی دیر تک ساغر کا انتظار کرتے رہے لیکن ساغر واپس نہ آیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک ساغر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ فلمی اخبار نکالنے میں ناکامی سے میرے لیے رزق کی تلاش ایک اہم مسئلہ بن گئی تھی اور میں مختلف اخباروں، رسالوں اور جریدوں میں نوکری کرنے یا مضمون لکھ کر معاوضہ حاصل کرنے کی بلا میں پھنسا ہوا تھا۔ حالات سے گھبرا کر لوہاری دروازے آ نکلتا اور ساغر سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ وہ فنا کے بعد معاشرتی و سماجی زندگی میں واپس تو نہ آیا لیکن تخلیق کی اُجلی وادیوں میں ضرور آ گیا تھا۔ جیسے اس کا شعور اور بصیرت واپس مل گئی ہو۔ وہ ہر روز تازہ شعر سناتا۔ موری دروازے کے باہر، لوہاری دروازہ کے فٹ پاتھ پر پادشاہ عالمی کے باغ میں گھنٹوں محفلیں جمتیں۔

وہ ایک سفر کا نشان ختم کر کے سفر کے دوسرے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے شعر زندگی کے حقیقی تجربے کی روشنی میں لپٹے ہوتے اس کا ہر خیال انوکھا اور منفرد ہوتا اور اس کا ہر لفظ زندہ اور باحُرمت ہوتا۔ شعر شناس لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ کئی اس کے فقیرانہ لباس سے متاثر ہو کر اس کے قریب آ جاتے اور ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس کی خود فراموشی کی عادت کا استحصال کر کے اس سے غزلیں لکھواتا اور اپنے نام سے چھپوا لیتا۔ اس کے انقلابی افکار جہاں معاشرے کی چیخ و پکار کے نمائندے تھے وہاں اس کے صوفیانہ تجربے کی بھی بازگشت تھے۔ تخلیق کی دنیا میں اس کی دوبارہ واپسی نے اس کے کئی ایسے مداح پیدا کر دیے جو جوشِ محبت میں اُس کو پابند کرنے کی سوچنے لگے۔ نثار ڈرائیور مرحوم اور پینٹر اختر نے اسے اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کی لیکن یہ

گھروں کی پابندیاں اس کی درویشانہ لگن کے لیے موت بن گئیں۔ ہر شخص اس سے ہمدردی کے بھید میں پابندیاں لگانا چاہتا تھا کہ ساغر اگر اس کے گھر میں رہتا ہے تو وقت پر آئے اور وقت پر جائے لیکن وہ زماں و مکاں کی پابندیوں سے نکلنے کے لیے جبر پر جبر برداشت کر رہا تھا اور گھروں میں لے جا کر لوگ اسے دوبارہ باہر نکال دیتے تو وہ اپنے دکھی احساس کے ساتھ ساتھ زمانے کے سلوک کا ان باغیانہ انداز میں اظہار کیا کرتا۔

جس عہد میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

ساغر کچھ عرصہ بعد اپنی ذہنی گمشدگی کی حالت سے پوری طرح باہر آگیا۔ اس کے انقلابی شعروں نے ایک مرتبہ پھر لوگوں کو چونکا دیا۔ وہ سیاہ چادر میں اپنے ہڈیوں بھرے جسم کو چھپائے مشاعروں میں جاتا تو ہال میں ہلچل سی مچ جاتی۔ لوگ اس سے ترنم کی فرمائش کرتے اور پھر اس کے اشعار کی حقیقت اس کی پُرسوز آواز کے ساتھ روحوں میں اتر جاتی۔ برسوں بعد بھی شاعرانہ عظمت اس پر سایہ فگن تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے شعروں کے سہارے زندہ رہنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے اداروں کے دروازے اس کے لیے بند تھے اور نہ ہی وہ کہیں جانا پسند کرتا تھا۔ اپنے فقیرانہ حال میں مست تھا اس کے پاس کچھ نہ ہوتا تو گوالمنڈی میں خواجہ شفیع کے پاس چلا جاتا خواجہ ہر روز پانچ روپے نذر کرتا۔ کچھ پبلشروں نے اپنی دکانوں پر کاپیاں رکھی ہوتی تھیں، دو روپے یا پانچ کے عوض اس سے کاپی پر غزل لکھوا لیتے۔ اس طرح اپنے آپ اس کے مجموعے لوحِ جنوں، غمِ بہار اور شبِ آگہی چھپ گئے۔ کبھی کبھی کوئی غزل لے کر ماہنامہ ڈائریکٹر کے چوہدری فضل حق مرحوم کے پاس چلا جاتا جہاں سے اسے دس روپے نقد مل جاتے۔ کوئی سہرا لکھوانے آجاتا تو ساغر سہرا لکھنے کے معاوضے کی رقم میں سے صرف پانچ روپے اٹھا کر کہتا۔

فقیر کو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں اور اس کی اس بات سے لوگوں نے سمجھ

لیا کہ ساغر کی قیمت صرف پانچ روپے ہے۔ قوال اس سے اس کا صوفیانہ کلام اور نعتیں لے جاتے، محفلوں میں ہزاروں روپے کماتے اور ساغر کو صرف کیپسٹن کی ڈبیا دے کر چلے جاتے۔ مہدی حسن خواجہ شفیع سے اس کی غزل "چراغ طُور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے" لے گیا اور اس کی آواز سے یہ غزل بھارت والوں کے پاس چلی گئی۔ ایک دن ساغر سوتر منڈی میں ایک پان کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا تو آل انڈیا ریڈیو کے کسی اسٹیشن سے کوئی گائیک اس کی یہی غزل گا رہا تھا۔ ساغر رُک گیا اور غزل کے اختتام پر اناؤنسر نے جب کہا۔

ابھی آپ پاک و ہند کے مشہور شاعر ساغر صدیقی کی غزل سُن رہے تھے۔ تو ساغر ہنس کر کہنے لگا۔

"واہ — اُن کو معلوم ہی نہیں کہ ساغر کس حال میں زندہ ہے۔ اچھا اللہ وارث ہے"

اخبار مارکیٹ میں "نوائے وقت" کے نیوز ایجنٹ بابو صادق مرحوم ساغر سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ساغر کوئی تازہ غزل یا نظم لکھتا تو وہ اسے "نوائے وقت" میں بھجوا دیتے۔ پتا نہیں ان دنوں "نوائے وقت" ساغر کو معاوضہ بھی دیتا تھا یا نہیں۔ لیکن بابو صادق کی خدمت کے باعث ساغر کا کلام باقاعدگی سے نوائے وقت میں شائع ہونے لگا جس سے ساغر ایک شاعر کی حیثیت سے ان لوگوں کو نظر آ رہا جو اس کے قریب نہ تھے۔ اخبار مارکیٹ میں وہ اس جگہ سویا کرتا تھا جہاں بابو صادق کے تانگے کا گھوڑا باندھا جاتا تھا۔ مارکیٹ کی تعمیر تو ابھی نہیں ہوئی تھی۔ مارکیٹ میں رہنے سے ساغر بیمار ہو گیا اور اتنا شدید بیمار کہ سب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ اخبار مارکیٹ ایک خالص تجارتی ادارہ تھا۔ کسی نے ایک دن توجہ کی کسی نے دو دن تک ساغر کا حال پوچھا۔ آخر وہ اپنے بیمار جسم کو لے کر بازار میں آ گیا۔ علاج کے لیے پیسے کہاں سے آتے اس کا تو روزانہ کا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اخبار مارکیٹ سے نکل کر وہ بڑا پریشان ہو گیا اور باہر آ کر اسے محسوس ہوا کہ اخبار مارکیٹ میں تو وہ بالکل سو نہیں سکا۔ رات کو وہاں آتا اور ابھی زمین پر اپنا پھٹا پرانا کمبل بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا ہوتا کہ اخبار مارکیٹ میں

چھاپہ خانوں سے اخبار آنا شروع ہو جاتے اور مارکیٹ میں سینکڑوں لوگوں کا شور بھر جاتا۔ ساغر کو یہ وہم ہو گیا کہ وہ بیمار ہی اخبار مارکیٹ میں رہنے سے ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک عرصہ تک اخبار مارکیٹ کا رخ نہ کیا البتہ اخبار مارکیٹ والوں نے اس کے لیے دروازے کھلے رکھے۔

بابو صادق نے ایک انتہائی خوبصورت بکرا پال رکھا تھا۔ ساغر اس بکرے کو بلو کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ بلو صرف پھل کھایا کرتا تھا اور اتنا شوخ تھا کہ سارا دن اخبار مارکیٹ میں ٹارزن کی طرح کبھی ایک چھت سے دوسری چھت پر اور کبھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک اچھلتا کودتا تھا اور کسی کے پچکارنے پر بھی قابو میں نہیں آتا تھا لیکن جونہی ساغر اس کا نام لے کر پکارتا ہوا اخبار مارکیٹ میں داخل ہوتا بلو بچوں کی طرح لاڈ کرتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ سا جاتا اور ساغر صدیقی وہیں بیٹھ کر اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتا، اس کے چھوٹے چھوٹے سینگ چومتا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جاکر پتا نہیں کس قسم کی باتیں کرتا کہ وہ خاموشی کے ساتھ سنتا رہتا۔ ساغر اسے کہتا۔ بیٹھ جا۔ تو وہ بیٹھ جاتا۔ ساغر تو اخبار مارکیٹ سے ناراض ہو کر چلا گیا، لیکن بلو اداس ہو گیا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور تمام دن گیٹ میں کھڑا آنے جانے والوں کو گھورتا رہتا۔

ساغر کا گزر تو روزانہ اس طرف سے ہوتا تھا لیکن وہ گیلانی پریس، نوبہار ٹی سٹال یا ناظم کے پان سگریٹ کے کھوکھے کے پاس بیٹھ جاتا اور اخبار مارکیٹ میں نہ جاتا۔ اخبار مارکیٹ میں سارے لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔ چوہدری رشید، شوکت، عظیم، عزیز، استاد بھجا تانگے والا، مولوی یونس اور سب کے سب اس کی دل سے خاطر داری کرتے تھے اور ساغر کو صرف یہ گلہ تھا کہ وہ بیمار ہے اور اخبار مارکیٹ والوں نے اس کے علاج کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مجھے لیل و نہار میں معاوضہ پر مضمون لکھنے کا کام مل گیا تھا اور لوہاری کا اسیر تھا۔ اس لیے ساغر سے ہر روز کبھی دن کو اور کبھی شام کو ملاقات ہو جاتی میں نے خود اسے ہسپتال میں لے جانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

"چھوڑو بابا۔ فقیر کی وہاں کون دیکھ بھال کرے گا؟"

وہ اس قدر لاغر ہو چکا تھا کہ ہر تیسرے قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کی روزانہ کی ضروریات مشکل سے پوری ہو رہی تھیں۔ اخبار مارکیٹ والوں نے اپنے طور پر ساغر کی بیماری کی اطلاع ایک اپیل کی صورت میں اخبار کو دی۔ اعجاز حسین رضوی احسان اخبار میں تھا۔ اس نے اس اپیل کو پہلے صفحے پر حاشیے میں شائع کیا۔ ساغر کی نظر سے یہ خبر گزری اور اس کے علاوہ اخباروں میں اپیل پڑھ کر لوگ اس کو ملنے اخبار مارکیٹ میں آئے تو وہ رنج زدہ تھا اور اس کا موڈ تلخ تھا کہ زمانے نے اسے رُسوا کرنے کی ایک اور کوشش کی ہے جبکہ فقیر نے دنیا اور دنیا والوں سے ہر قسم کی توقع ختم کر دی ہے اور یہ پھر بھی فقیر کو زخم لگانے سے باز نہیں آتے۔ لیکن اس اپیل کے چھپنے پر پتا نہیں کس کس نے اس کی مدد کی اور تین سو روپے نقد اور ایک کمبل اسے اخبار مارکیٹ کے ذریعے مل گیا۔ کمبل بہت خوبصورت اور ملائم تھا۔ ساغر نے دوا دارو کرنے کی بجائے فوری طور پر نئی دو سیاہ چادریں خریدیں بوسیدہ چادر پھینک دی اور وہ کمبل کندھے پر رکھ کر ایک شام مسلم مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ کسی بے وقوف نے اسے روک کر کہا۔

"ساغر صاحب! اگر کمبل بیچنے کو دل چاہے تو میں ہر وقت تیار ہوں۔"

ساغر کو اس بات سے بے حد صدمہ ہوا اور وہ دل گرفتہ سا ہو کر شہر سے باہر چلا گیا میں رات کو گھر جانے کے لیے بھاٹی دروازے کے باہر کسی تانگے کا منتظر تھا کہ ساغر اپنے آپ کو ایک طرف جھکائے چلا آ رہا تھا۔ میں نے آواز دی لیکن وہ چلتا ہی گیا اور میں نے بھاگ کر اسے روکا تو آزردہ نظر آیا۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔

اس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"خریداروں میں گھرا ہوں اور ان سے بچ کر جانا چاہتا ہوں۔ ویسے کوئی منزل نہیں۔"

اس نے کھڑے کھڑے اپنا سارا رنج اگل دیا کہ جب کبھی اسے کوئی نیا لباس ملتا ہے لوگ اس پر نظریں جما دیتے ہیں۔ یہ کمبل اللہ نے دیا ہے تو ہر کوئی اسے چھو کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔ آخر بک ہی جانا ہے۔ عجیب لوگ ہیں فقیر کے پاس کچھ دیکھنا نہیں چاہتے۔"

ویسے ساغر صدیقی کو یہ کمبل بہت پسند تھا۔ اسے ہر وقت ساتھ رکھتا۔ فٹ پاتھ پر نشست جمانے کے لیے کمبل زمین پر بچھاتا تو پہلے زمین صاف کر لیتا۔ گھنٹوں اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر کہتا۔

"یہ زندہ اون کا کمبل ہے۔ فقیر کے لیے اللہ کی خاص عنایت ہے"۔

کمبل مل جانے کی مسرت میں وہ اپنی بیماری کو بھی بھول گیا، کیونکہ سردیاں آنے والی تھیں اور اس کے پاس بستر تک نہ تھا۔ لہٰذا اپنے کمبل کی اس طرح حفاظت کر رہا تھا جیسے پوری کائنات اس کمبل میں سمٹ آئی ہو۔ اسی دوران بابو صادق نے اسے بلا بھیجا کہ سردیاں آنے والی ہیں ۔ اخبار مارکیٹ میں بابو صادق کی کوٹھڑی سردیاں گزارنے کے لیے جنت سے کم نہ تھی۔ لیکن ساغر کو یہ جنت قبول نہ تھی۔ جہاں اس کا دل چاہتا رات کو کمبل بچھا کر سو جاتا۔ اپنی ذات سے یہ بے نیازی اس کی شخصیت اور کردار کا اہم پہلو بن گئی تھی۔ وہ جہاں ہوتا اس کے مداح پہنچ جاتے۔ ان میں شاعر بننے کے شوقین نوجوان، فقیر پرست، بیکار اور زندگی سے گھبراتے ہوئے لوگ اور ایسے عقیدت مند بھی شامل تھے جن کے نزدیک ساغر کے نحیف و نزار جسم اور بوسیدہ کپڑوں کے اندر کوئی گہرا آدمی چھپا ہوا ہے اور جسے ساغر چھپانے کی شعوری کوشش میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ اس کے شعر سرکلر روڈ پر حلیم لگانے والے، پھل فروش ہوٹلوں کے ملازم، دکانوں کے کاریگر اور ان پڑھ لوگ بھی بڑے غور سے سنتے تھے۔ اور ساغر ان پڑھ لوگوں میں بھی احساس کے حوالے سے اپنے شعروں کا مفہوم منتقل کر دیتا تھا۔ اس کی مکمل تباہ حالی نے اس کی مٹی ہوئی شخصیت کو اتنا پرکشش بنا دیا تھا کہ لوگ بڑی چاہت اور عقیدت سے اسے ملتے تھے اور اسے اس کسمپرسی میں بھی اپنے سے کوئی بڑا انسان سمجھتے تھے۔ ساغر جہاں بھی جس موضوع یا مسئلے پر بات کرتا لوگ مطمئن ہو جاتے۔ اس کے شعروں میں زندگی کی حقیقت کو فوراً جان لیتے۔ کچھ تقدیر کے حوالے سے ساغر کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے کہ کتنا بڑا انسان کس حال میں رہ رہا ہے۔ ساغر کی زندگی کا یہ دور اس کے فکر و فن کے مکمل عروج کا دور تھا۔ اس پر شعروں

کا الہام ہوتا تھا اور وہ ایسی باتیں کہہ جاتا کہ عقلیں درہم برہم ہو جاتیں۔
میں ساغر کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے کے متعلق سوچتا تو اس خیال سے قلم نہ چلتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فقیر کے راز بیان کرنے کا مجرم بن جاؤں لیکن یہ جذبہ بہت طاقت ور تھا کہ میں اس شہر کے لوگوں کو بتاؤں کہ ساغر سے اس کا حق چھین کر وہ کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں اور اگر وہ اسی حالت میں مرگیا تو انہیں کتنا بڑا نقصان پہنچے گا۔ یوں تو ساغر پاک و ہند کے علمی ادبی حلقوں میں اپنے افکار کی روشنی سے اچھی طرح جانا پہچانا جاتا تھا لیکن علم و ادب کے کسی بھی جبہ و دستار کے مالک نقاد یا دانشور نے اس کا اعتراف کرنے کی جرأت نہ کی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سچا عوامی شاعر صرف ساغر ہے۔ جس سے لوگ اس لیے پیار کرتے تھے کہ اس کا ذہن ابدی صداقت کا نمائندہ تھا۔
میں نے لیل و نہار کے ۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں ساغر پر ایک مضمون قلمی نام بھاں گرد کے نام سے لکھا۔ جس کا عنوان نصیر انور نے "تاریک رات کا سایہ" رکھا۔ میں نے اس پر احتجاج کیا، لیکن نصیر انور کی سوچ اس قسم کی تھی کہ ساغر نے اپنے آپ کو انسانوں کے سامنے اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش نہیں کیا۔ مثال کے طور پر وہ اچھے لباسوں، اچھے گھروں اور اچھے کھانوں کی تلاش میں کیوں نہیں نکلتا۔ بہرحال یہ مضمون چھپا تو قریبی لوگوں کو پتا چل گیا کہ مضمون میں نے ہی لکھا ہے۔ اس میں حفیظ قندھاری کی اتاری ہوئی ساغر کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔

اس مضمون کے بارے میں سینکڑوں خطوط آئے جن میں خواتین اور لڑکیوں کے خط زیادہ تھے۔ ان میں ساغر کے حالات پر گہرے دکھوں کا اظہار کیا گیا تھا اور بعد میں پتا چلا کہ دو برقعہ پوش لڑکیاں کئی دن تک کار میں اسے تلاش کرنے اخبار مارکیٹ میں آتی رہیں۔ ساغر کے ردعمل کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ وہ سخت ناراض ہے اور کہہ رہا ہے کہ یونس ادیب اور حفیظ قندھاری نے فقیر کو رسوا کیا ہے اور دونوں فقیر کا نام بیچ کر کھا گئے ہیں۔ ساغر کئی دنوں تک ناراض رہا۔ بازار میں ملتا تو راستہ کاٹ جاتا۔ میں بڑا پریشان ہو گیا۔ اب ملاقات کا ذریعہ صرف ہمارے روحانی پیشوا برق رحمۃ اللہ علیہ تھے، جہاں وہ دن میں گدڑی لپیٹے ایک مرتبہ ضرور آتا تھا۔ اپنی نشست جوتیوں کے قریب جمانے کی کوشش میں گدڑی بچھا رہا ہوتا کہ برق رحمۃ اللہ علیہ اسے اپنے پاس بلا لیتے ساغر دوزانو ہو کر سامنے بیٹھ جاتا۔ اپنے آپ کبھی سگریٹ اٹھا کر نہ پیتا۔ قبلہ سگریٹ پیش کرتے تو بڑے ادب سے سبحان اللہ کہہ کر قبول کرتا۔ برق رحمۃ اللہ علیہ کی محفل میں جتنی دیر رہتا، خاموش ہوتا اور آنکھیں جھکائے رکھتا۔ قبلہ برق رحمۃ اللہ علیہ اس سے خاص پیار کرتے تھے اور بڑی دلجوئی فرماتے تھے۔ اکثر ساغر سے اس کی غزل "یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں" سننے کی فرمائش کرتے تو ساغر دل کی گہرائیوں سے یہ غزل ترنم سے سناتا اور برق رحمۃ اللہ علیہ تڑپ کر جھوم اٹھتے اور بار بار ایک سرمدی کیف میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے۔ ساغر کو دعا دیتے۔ اللہ تمہارے حال کو سلامت رکھے۔

پھر وہ ساغر کو کچھ پیسے دیتے اور ساغر چوم کر وصول کرتے ہوئے اشکبار ہو جاتا۔ جاتے ہوئے بھی وہ مجھ سے آنکھ تک نہ ملاتا اور اکرام لدھیانوی کہتا۔

"آؤ۔ اس سے چل کر چائے پیتے ہیں"

برق رحمۃ اللہ علیہ کو جب معلوم ہوا کہ ساغر مجھ سے مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں ناراض ہے تو انہوں نے فرمایا۔

"یہ ملیا میٹ فقیر ہے اور صبر اس کا پیشہ ہے۔ ہمیشہ محتاط رہنا۔ پتا نہیں کس بات سے ناراض ہو جائے اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا۔"

میں نے عرض کیا کہ میری نیت ٹھیک تھی، لیکن چاہتا ہوں کہ تعلقات بحال ہو جائیں۔

برق رحمۃ اللہ علیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر فرمایا "بحال ہو جائیں گے"۔

اسی شام میں کسی کام سے نیچے انار کلی میں آیا تو ساغر نے جالندھر کیفے کے باہر آواز دے کر بلا لیا۔ اس کے ہاتھ میں برفی تھی اور ایک ٹکڑا مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"یہ برفی کھا کر مجھے امرتسر کی برفی یاد آجاتی ہے"۔

وہ اس طرح مجھ سے باتیں کر رہا تھا جیسے ناراضگی سے پہلے کیا کرتا تھا۔ وہ مجھے پیسہ اخبار کے کالے خاں کے ہوٹل میں لے گیا۔ کالے خاں کا ہوٹل بمبئی کلاتھ ہاؤس والی گلی کی ایک دکان کا نام تھا اور ساغر نے کالے خاں کا نام مولانا بھاشانی رکھا ہوا تھا، کیونکہ کالے خاں اور مولانا بھاشانی کے حلیے میں کوئی فرق نہیں تھا اور میں جب بھی اکرام یا ساغر کے ساتھ کالے خاں کے ہوٹل میں جاتا، کالے خاں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ مولانا بھاشانی یاد آجاتا۔

کالے خاں کے ہوٹل میں ساغر نے مجھے چائے پلائی، اعلیٰ نسل کے سگریٹ پیش کیے اور دو تین تازہ غزلیں سنائیں میں نے کاغذ پر لکھنے کا ارادہ کیا تو کہنے لگا۔

"یہ آج ہی کوئی خرید کر لے گیا ہے"۔

ساغر کے کلام کے ان گنت خریدار اسے تلاش کیا کرتے تھے اور وہ انہیں اس وقت ملتا جب اسے پیسوں کی شدید ضرورت ہوتی۔ اس کی نظم "جو گی" ایک مشہور رسالے میں ایک ایڈووکیٹ کے نام سے چھپی تو دھوم مچ گئی اور ایڈووکیٹ شاعر جس محفل میں یہ نظم سناتا لوگ تڑپ تڑپ اٹھتے۔ میں نے اس ایڈووکیٹ کو اکثر لوہاری دروازہ کے باہر ساغر کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تھا اور مجھے بہت دکھ ہوا۔ ایک ایڈووکیٹ سماجی زندگی میں زندہ ہو رہا تھا اور ساغر مر رہا تھا۔ وہ جب بھی ملتا اس کے پیر زخمی ہوتے وہ انار کلی میں لیٹر بکس کا سہارا لیے کھڑا ہوتا اور گزرنے والوں کو اس طرح دیکھتا جیسے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

شہر والے اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے اور اجنبیوں کو اس کے روپ میں کوئی

ایسا البیلا پن نظر آتا تھا کہ اس کے پاس رک جاتے۔ ساغر پوچھتا آپ کون ہیں؟
بس آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ اجنبی کہتا۔
مجھے کیا دیکھتے ہو۔ اپنے آپ کو دیکھو تو بھلا ہی نہ ہو جائے۔ اگر مجھے دیکھنا ہے تو لو دیکھ لو۔ یہ کہہ کر وہ اپنے جسم سے چمٹی ہوئی سیاہ میلی چکٹ چادر ہٹا دیتا اور اجنبی ہڈیوں کا پنجر دیکھ کر بھکر ہو جاتا۔ پھر ایسا ہوتا کہ وہ بالکل بے رنگ دکھائی دینے لگتا۔ مسلسل خود کلامی کرتا۔ اس کی بے ربط اور مبہم باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آتیں اور مہینوں تک اسی حالتِ غیب میں رہتا اور اس سے باہر آتا تو اس نے لوہاری دروازہ کے باہر پاک لینڈ پریس کے پرانے دروازے میں گدڑی بچھائی ہوتی۔ اپنے مداحوں کے ساتھ بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہوتا۔ سگریٹوں پر سگریٹ سلگ رہے ہوتے اور لہک لہک کر باتیں کرتے ہوئے بازو ہلاتا تو اس کی کلائی میں سلور کی زنجیر چمک چمک کر بتا دیتی کہ ساغر چھلک پڑا ہے۔ ہر آنے والے کو بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے اتنا مسرور ہو جاتا کہ اس کے ہونٹوں سے سبحان اللہ اور اللہ بھلا کرے کے جملے پھولوں کی طرح جھڑنے لگتے۔
ملنے والے جب بھی اسے ملتے شعر سننے کی خواہش کا اظہار ضرور کرتے اور ساغر "بے رنگ" نہ ہوتا تو کسی کو مایوس نہ کرتا۔ لیکن موڈ نہ ہوتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ فقیر اپنے آپ میں حاضر نہیں ہے پھر کبھی سہی۔ اس کی نظر کمزور ہوتی جا رہی تھی اور وہ کاغذ پر جھک کر لکھتا تھا۔ لکھتے وقت کاغذ بالکل آنکھوں کے قریب لے آتا لیکن لکھنے کی روانی پہلے سے پُرجوش ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے مختصر سے سامان کے لیے تھیلا اور زنبیل رکھنے لگا تھا۔ چمڑے کے چھوٹے تھیلے سے بور ہو جاتا تو اسے کسی جاننے والے کے پاس رکھ دیتا اور دوبارہ بھول کر بھی یاد نہ کرتا۔ ہمیشہ نیا تھیلا اور نئی زنبیل اس کے ہاتھ میں لٹک رہی ہوتی۔ جس میں وہ لکھنے کے لیے قلم کاغذ اور آلاتِ مدہوشی کے علاوہ ہر وہ چیز سنبھال کر رکھتا جو راہ چلتے ہوئے اسے اچانک پسند آ جاتی۔ اس نے ان دونوں چیزوں کا نام بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ ایک روز ساغر کے پاس بڑے نوٹ تھے۔ اس نے ایک بیٹری، ایک کنگھی اور ایک آئینہ خریدا۔ دکان پر اسے

چین کا بنا ہوا چھوٹا چاقو بھی نظر آیا۔ تعریفیں کرتے ہوئے کافی دیر تک وہ اسے اُلٹ پُلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چاقو مجھے دے کر کہا۔

دیکھنا کس ملک کا بنا ہوا ہے؟

میں نے پڑھ کر بتایا کہ چین کا بنا ہوا ہے۔ چین کا نام سُن کر خوش ہو گیا اور کہنے لگا: "اسے خرید لینا چاہیے۔ دوست ملک کا ہے"۔

ساغر کے پاس پیسے آ جاتے تو وہ ایک ہی دن میں خرچ کر دیتا۔ سوچی ہوئی چیزیں خرید لیتا۔ اسے اچھے سگریٹ پینے کے علاوہ اچھے قلم سے بھی لکھنے کا بہت شوق تھا اس نے کئی بار گھڑی خریدی اور دوسری چیزوں کے علاوہ گھڑی بھی کچھ عرصہ بعد بک جاتی۔ پھر وہ سرکلر روڈ کے اس حصے سے غائب ہو جاتا اور سرکلر روڈ والوں کے پاس اس کی یادیں رہ جاتیں۔ سرکلر روڈ پر چھوٹا بتریاں والا ایک سادہ لڑکا اس کا بہت مداح تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا لیکن ساغر کی باتیں سننے کے لیے اس کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ ساغر سرکلر روڈ پر آ جاتا تو چھوٹا بتریاں والا سارے کام چھوڑ دیتا اور اپنے آپ کو ساغر کے پیار کے حوالے کر دیتا۔ ساغر بھی اسے دور ہی سے دیکھ کر آوازیں دینے لگتا۔

"ارے چھوٹو۔ ارے چھوٹو خاں"۔

چھوٹا بتریاں والا لپک کر آتا اور بے ریا جذبے سے کہتا۔ "آؤ۔ بابا کیا حکم ہے"۔

لیکن سرکلر روڈ سے ساغر کی غیر حاضری طویل ہو جاتی اور لوگ چھوٹے سے پوچھتے۔

"چھوٹے تیرا بابا ساغر کہاں ہے؟"

چھوٹا شکایت بھرے لہجے میں کہتا۔

"بابا ساغر کی بات چھوڑو۔ وہ بے وفا آدمی ہے"۔

یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ساغر بے وفا تھا یا وفادار۔ لیکن اس کی زندگی ایک وفا شناس کی طرح گزری ہے۔ اس کی وفاؤں کا مرکز حقیقت الوہیت تھی جس کا ادراک اسے سب کچھ لٹ کر ملا تھا۔ لیکن اس نے جس بھید کو پایا تھا اسے وعدے کے مطابق سینے میں چھپا لیا تھا اور دیکھنے والوں کے سامنے اس کے کئی روپ تھے۔ لیکن اپنے حقیقی

روپ سے وہ خود ہی آگاہ تھا اور انتہائی حالت کی انکساری اور بے قیمت ہونے کے سچے احساس کے ساتھ اس نے اپنی شخصیت کو اتنا گداز بنالیا تھا کہ لوگ اس کے شعروں میں اس کی جھلک سے یہ اندازہ لگانے لگے کہ وہ یاسیت کا شکار تھا، حالانکہ وہ سراسر روحانی غم کا امین تھا اور اس روحانی غم کا اظہار صرف خاص جاننے والوں یا اپنے شعروں میں کرتا تھا۔ عام طور پر تو لوگ اسے دیوانہ شاعر سمجھ کر ملتے تھے اور باتیں اس کی اتنی مبہم ہوتی تھیں کہ اس سے ہزاروں مفہوم اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ جس نے اسے جس روپ یا شکل میں دیکھا اس نے اسی روپ کو ساغر سمجھ لیا اور ساغر نے اپنے حقیقی روپ کو کئی بہانوں سے چھپائے رکھا۔ ساغر کا حقیقی روپ ایک سچے فقیر کا روپ ہے اور فقر و درویشی کی راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ فقیر کا حال ہی رنج والم ہے۔ رنج والم کیساتھ نباہ کرنا اور ہمیشہ غم واندوہ ہی میں قرار پانا فقیروں کا ہی کام ہے۔ ساغر بھی ایک فقیر ہے جس نے زمانے کو پھول دیے اور اپنی جھولی کانٹوں سے بھرلی۔

ساغر خواب و خیال کی باتیں کیا کرتا تھا اور غم کے ایک سلسلے میں منسلک ہونے کے باوجود اس کی خواب و خیال کی باتوں میں اس کا شعور و فہم اور احساس انگڑائیاں لیتا تھا۔ اس کے چہرے کا ہر تاثر فکر انگیز ہوتا جارہا تھا اور اس کی بے نیازی کی شان بلند سے بلند تر ہورہی تھی۔ اس کے پاس طلب نہیں تھی، وہ حسن طلب کا عظیم شاہکار تھا وہ کہا کرتا تھا کہ غم ہی فقیر کی زندگی ہے۔ شاعر تو بہت ہیں لیکن ساغر کی فقیری زندہ رہے گی اور یہ نہیں جانتے کہ کون ان کے قریب سے سائے کی طرح گذر جاتا ہے۔

ملنے جلنے والوں کے ساتھ ساغر کا رویہ اس کی درویشانہ سیرت سے تعبیر ہوا تھا جس میں اس کی انا بھی شامل تھی، لیکن اس کی انا سے آج تک کسی کو دکھ نہیں پہنچا، نہ ہی اس نے کسی کو اپنی انا زخمی کرنے کی اجازت دی اور نہ ہی اس نے کسی کو محبت اور نیکی سے محروم کیا ہے۔

ساغر کا یہ زمانہ بھی بڑے اتار چڑھاؤ میں گزرا۔ زمین پر سوتے سوتے دل چاہا تو شاہ عالمی کے باغ میں اس نے خلیفہ ننکا کے ڈیرے پر ایک درخت کے نیچے چارپائی

ڈال لی۔ گرمیوں میں وہ دوپہر کو بھی باغ میں آجاتا۔ یہ باغ پہلے بڑا خوبصورت تھا لیکن اجڑ گیا تھا۔ جس درخت کے نیچے ساغر سویا کرتا، اس کے ساتھ خلیفہ اپنی بھینس باندھتا تھا اور شہر کی فصیل کے ساتھ بہنے والی بدرو پر بنی ہوئی خلیفہ ٹکا کی کوٹھڑی کی دیوار کے نیچے کالو رہتا تھا۔

کالو اس باغ میں ساغر کا قریبی ہمسایہ تھا۔ سیاہ لمبے بالوں والا یہ کتا بھی اس سے بڑا پیار کرتا تھا۔ نہ زیادہ بھونکتا تھا اور نہ زیادہ کھانے کے لیے ادھر ادھر منہ مارتا۔ پیٹ بھر جاتا تو دیوار کے نیچے خاک پر منہ رکھ کر سو جاتا۔ ساغر خلیفہ ٹکا سے تو بہت کم بات کرتا لیکن کالو سے جی بھر کر باتیں کرتا۔ جب بھی گھوم پھر کر باغ میں آتا۔ کالو کے لیے کبھی کھیر، کبھی کباب اور کبھی کوئی اچھی کھانے کی چیز اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ باغ میں داخل ہوتے ہی کالو کو بڑے پیار بھرے لہجے میں پکارتا۔

"کالو — او — کالو"

کالو اگر باغ میں ہوتا تو ایکدم اٹھتا اور ساغر کی میلی چکٹ دھوتی سے اپنا منہ رگڑتا اس کے پیروں کو سونگھتا اور بچوں کی طرح کبھی اس کے آگے اور کبھی پیچھے بھاگتا۔

ساغر اسے لاڈ سے جھڑکتا۔

"جا۔ میں نہیں تم سے بولتا۔ اتنی آوازیں دی ہیں۔"

"بھاگ جا۔ چلا جا۔ کالو کا بچہ۔"

کالو اس کے لہجے کی خفگی فوراً محسوس کر لیتا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتا۔ ساغر چارپائی پر اپنی گدڑی رکھ کر اس کی طرف دیکھتا اور کالو کو چپ چپ بیٹھے دیکھ کر کہتا۔

"روٹھ گیا ہے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا، دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں؟"

کالو آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا اور ساغر اپنے ہاتھ سے کالو کو کھلاتے ہوئے باتیں کرنے لگتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ ساغر باغ میں آتا تو کالو موجود نہ ہوتا۔ ساغر باغ کے ایک ایک کونے میں اسے تلاش کرتا۔ بدرو عبور کر کے آوازیں دیتا اور ردی والوں سے پوچھتا۔

"تم نے کالو کو تو نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟"

غلیفہ نکا بڑا خوش تھا کہ ساغر بابا نے اس کے ہاں ٹھہرنا پسند کیا تھا اور غلیفہ نکا مجھ سے کہتا۔

"میں نے سرکار سے کبھی نہیں پوچھا کہ کب آئیں گے اور کب نہیں آئیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا موڈ ہی خراب ہو جائے۔"

میں نے غلیفہ نکا سے کہہ دیا تھا کہ اسے ٹوکا نہ کرے اور شاید یہی وجہ تھی کہ باغ میں اس نے ایک طویل عرصہ قیام کیا۔ رات کو بارش ہو جاتی تو اٹھ کر کوٹھڑی میں آتا تو کالو بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ ساغر نے گرمیاں باغ میں گزاریں۔ جب سرد ہوائیں چلنے لگیں اور کمبے کی بوسیدہ و سیاہ چادر سردی سے اس کے جسم کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو گئی تو ساغر چارپائی باغ میں ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک شام میں باغ میں ساغر سے ملنے گیا تو غلیفہ نکا بڑا پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے دور ہی سے کہا۔

"سرکار تو چلے گئے۔ میں تین دن سے انتظار کر رہا ہوں اور ان کا بستر اٹھا کر میں نے کوٹھڑی میں بھی رکھ دیا کہ اب باہر سونے کا موسم نہیں رہا۔ لیکن سرکار تو ایسے غائب ہوئے جیسے باغ میں کبھی آتے ہی نہ تھے۔ اچھا سرکار کی مرضی۔"

تین چار دن بعد وہ مجھے لوہاری کے باہر ہسپتال روڈ کے موڑ پر ناظم کے کھوکھے کے قریب زمین پر بیٹھا مل گیا۔ ناظم بھی ساغر سے پیار کے رشتے کا ساتھی تھا۔ ساغر روز دوسرے تیسرے ناظم کے کھوکھے پر ضرور آتا تھا۔ ناظم سے جتنی بھی خدمت ہو سکتی دل کھول کر کرتا۔ ساغر اسے ناظم الدولہ کہہ کر پکارا کرتا تھا اور تقریباً روزانہ ناظم کے پاس اس کی نشست ہوتی۔ تازہ شعر سناتا، گرد و پیش کے حالات پر تبصرہ کرتا۔ سگریٹ پیتا چائے آتی اور پھر وہ اچانک اپنا بریف کیس اٹھا کر مستانہ وار آگے نکل جاتا۔ سردیوں میں وہ انارکلی کے ایک درزی خانے میں رہا کرتا تھا۔ درزی خانے کے عاشق صاحب اس کے بڑے قدردان تھے جہاں وہ رات گئے آتا اور میلے کچیلے لحاف میں منہ چھپا کر سو جاتا۔

زندگی کے بارے میں اس کا رویہ اس کی ان سوچوں کا نتیجہ تھا جسے اس نے اپنے وجدان اور ادراک سے حاصل کیا تھا اور اس کے خیال اس کی سوچیں اور اس

کا گھر بھی اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھا لیکن یہ سرمایہ بھی وہ اپنے پاس نہ رکھتا اور کاغذوں پر منتقل کر کے معاشرے کے سپرد کر دیتا۔ وہ بہت موڈ میں ہوتا تو کہتا۔

"خود کبھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا تھا، کیا ہوں، نہیں تھا اور ہوں۔ لیکن پھر میں نہیں ہوں۔ اپنا تو راز داں کوئی نہیں۔ ہم زباں کو کہاں تلاش کروں۔ زمانہ تاجر ہے اور محرم بے ایمان ہے اپنا حق کس سے مانگوں۔ میں اپنے جسم کی طرف دیکھتا ہوں تو سوچنا پڑتا ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اللہ نے میرا ذہن ضرور سلامت رکھا ہے۔ اگر میرا سر نہ ہوتا تو میرا جسم بھی لوگوں کو نظر نہ آتا۔ بس خیال بڑی طاقت ہے، وہ خیال جو روح کی پاکیزگی کی گود میں جنم لیتا ہے۔"

ساغر کی یہ ساری ادھوری باتیں سارے لوگ سنتے تھے اس کی صورت دیکھتے تھے وہ ان سب کی صورتیں پڑھ رہا تھا اور لفظوں کی صورتیں ان کے حقیقی مفہوم کے رنگوں سے سنوار رہا تھا۔ سارا شہر اس کا گھر تھا لیکن اس کا کوئی گھر نہیں تھا اور گھروں کی باتیں شروع ہو جاتیں تو کسی باغ میں ادبی کٹیا بنانے کے منصوبے کی تفصیلات بتانے لگتا۔ ادبی کٹیا کا منصوبہ کوئی پنجسالہ منصوبہ نہیں تھا لیکن اس کا مکمل ہونا مشکل تھا ویسے ایک ایسے کمرے کو کرایہ پر لینے کا بہت آرزومند تھا جہاں وہ مکمل خود مختاری کے ساتھ رہ سکے۔ اس نے کئی بار کمرہ کرائے پر بھی لیا، لیکن دوسرے مہینے اپنا سامان تک وہاں چھوڑ کر پھر فٹ پاتھ پر آ گیا۔ ادبی کٹیا کی تفصیلات طے ہونے لگتیں کہ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو گا اور اس کے اوپر سرخ پرچم لگائیں گے۔ ایک طرف فقیر کا بستر ہو گا، کچھ کھانا پکانے کا سامان ہو گا اور "بزم سخن" سجائیں گے۔ اس کے پاس کہیں سے ڈھیر سارے پیسے آ جاتے تو وہ انگیٹھی، کیتلی، گلاس، دری اور اسی قسم کا دوسرا سامان خرید لیتا۔ چند دن تک اخبار مارکیٹ یا پاک لیڈر پریس میں یہ سامان پڑا رہتا ایک دو مرتبہ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے پکاتا جسے وہ فرشتوں کا کھانا کہا کرتا تھا۔ خود تو وہ بہت کم کھایا کرتا تھا البتہ کھانے کی محفلیں اکثر منعقد کرتا۔ اگر اس نے چند دنوں تک کسی جگہ قیام کر لیا تو وہاں شام کو آنے کی دعوت سب کو دیتا اور خود ہمیشہ دیر سے پہنچتا۔ اتنی دیر میں

وہاں ہجوم جمع ہو چکا ہوتا۔ اسے دُور دُور سے لوگ ملنے کے لیے آتے اور وہ ان میں ایک دانا انسان کی طرح بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ بڑا بیدار تھا اور ہر وقت آسمان کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ وہ دن اس پر بڑی تنگی کے تھے اور اخبار مارکیٹ کے سامنے گیلانی پریس میں قیام پذیر تھا۔ گیلانی پریس اب پریس نہیں تھا، ایک منزلہ کمرہ جس کی چھت پر جالا لگا ہوا تھا اور کالی سیاہ دیواروں کا پلستر گرتا رہتا تھا۔ درمیان میں ٹوٹی ہوئی دو پرانی میزیں تھیں اور یہاں ہر شخص جس وقت بھی چاہے آسکتا تھا۔ ساغر نے ایک کونے میں ڈیرہ لگایا ہوا تھا، اور سرِ شام وہاں آجاتا تھا۔ اس دوران اس نے کئی ولولہ انگیز ترانے لکھے وہ اخباروں میں تو شائع ہوئے لیکن ریڈیو نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

ساغر سائرن کی آواز سے اس حد تک مانوس ہو گیا کہ آواز سنتے ہی وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب جاتا۔ جانبازوں کی خبریں اپنے عنوانوں کے ساتھ سناتا۔ اس نے لاہور کی فضاؤں میں لڑاکا طیاروں کی جھڑپ دیکھی تو اس نے یہ قطعہ لکھا۔

آوازِ مُغنّی ہو کہ غازی کا علم ہو
تاریخِ شجاعت کے لیے آنکھ کے تارے
بجلی کی طرح خرمنِ اغیار پہ کڑکو
ہر آن ہے شاعر کا قلم ساتھ تمہارے

ناظم کہتا ہے کہ بابا ساغر ساری رات جاگتا رہتا تھا اور صرف جنگ کی باتیں کرتا تھا۔ تاریخ اسلام کے تمام جنگی واقعات کے عظیم ہیروز اس کے حافظہ میں محفوظ تھے اور ان کی شجاعت، بہادری، تدبر اور جانفروشی کا ذکر کرتے ہوئے مسحور سا ہو جاتا تھا۔ اسے پاکستان کی افواج سے عشق تھا اور وہ پاکستان کی حرمت کا زبردست محافظ تھا جنگ کے دوران وہ داتا حضورؒ کی درگاہ کی طرف جا رہا تھا کہ اسے بھاٹی کے چوک میں قومی رضاکاروں کا ایک چاق و چوبند دستہ مارچ کرتا ہوا نظر آیا۔ قدم سے قدم ملا کر قومی جذبے سے سرشار رضاکاروں کو ایک منظم شکل میں دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے

جلدی سے مٹھی میں پکڑے ہوئے روپے کے پھول لیے اور ان پر برساتا ہوا کئی قدم ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ واپس آکر کہنے لگا۔

"حضرت! ان کو دیکھ کر زندگی کی تنظیم کا وقار نظر آتا ہے!"

ساغر اپنی درویشانہ ڈگر پر بڑے مزے سے چل رہا تھا لیکن معاشرہ جس ظالمانہ نظام کے چنگل میں گرفتار تھا، اس کے اثرات اس کی فقیرانہ زندگی پر بھی بڑے گہرے تھے۔ وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں تھا، روزانہ کئی اخباروں کا مطالعہ کرتا تھا۔ لوگوں کی باتیں سنتا اور ان کے رہن سہن اور اخلاقی اعتبارات کا ماہرانہ تجزیہ کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے بنیادی مقاصد کو اتنا ہی سمجھتا تھا جتنا کہ کوئی بڑے سے بڑا سیاسی مفکر سمجھتا ہے اور سیاسی قیادت پر اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ معاشرے کو قومی قدروں کی روشنی میں تعمیر کرنے سے مجرمانہ طور پر غافل ہے اور اسلام کی اس روح کے حوالے سے جو سب انسانوں کو انسانوں کے درمیان برابر کی آزادی، احترام اور انصاف کی ضمانت دیتی ہے۔ اس بات کا خواہاں تھا کہ پاکستان کے عوام سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کی حیثیت سے کیوں نہیں سمجھتے کہ ہر کام میں نیکی اور سچائی اختیار کیے بغیر وہ اپنے عہد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ورنہ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے فوراً بعد اس نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ حالات کا رخ بدلنے والا ہے۔ میں مشرق سے ایک نیا سورج طلوع ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ اسے اور بھی بہت کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے شاہ عالمی کے باہر قیصر سرائے میں دو روپے روز پر ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا، جہاں اس نے پھر ایک چولہا، ایک پتیلی، چاقو، ٹوٹی ہوئی چینک، پلاسٹک کا گلاس، شکستہ چارپائی اور میلا کچیلا بستر جمع کر لیا تھا۔ صبح ہی صبح اپنی زنبیل بازو میں ڈال کر شہر میں داخل ہو جاتا۔ تانگوں بسوں، موٹروں، رکشاؤں اور راہگیروں کے تیز رفتار ہجوم میں جہاں سب لوگ کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کے لیے تیز تیز چل رہے ہوتے، وہ صرف اپنے خیال کے

حسن میں ڈوبا ہوتا اور شام کو کبھی کبھی واپس آتے وقت بڑے دکھی انداز میں کہتا۔
"ان لوگوں میں رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لوگ تو اوپر سے گزر جانے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں"۔
تنگدستی تو ساغر کا مقدر تھی لیکن بعض اوقات اسے اس شہر میں روزانہ کی حقیر ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی بڑی ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑتی تھی اور قیصر سرائے کا روزانہ کرایہ ادا کیے بغیر وہ روشنی اور ہوا سے محروم کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر میں سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو ساغر کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نقدی نذر کرتے تھے، جن کے لیے وہ اکثر ممنونیت کا پرجوش اظہار کیا کرتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ لیتا تو سب سے پہلے چومتا پھر اپنے مخصوص انداز میں اللہ بھلا کرے کہہ کر جھومنے لگتا اور فوراً ہی چلا جاتا۔ ایک دن میکلوڈ روڈ پر گھوم رہا تھا کہ مجھے انور بٹالوی اور فلم سٹار علاؤالدین کے ہدایت کار بھائی ریاض احمد راجو کے ساتھ کھڑے دیکھ کر آ گیا۔ راجو نے پوچھا۔
"بابا جی۔ کہاں ہوتے ہیں آجکل"۔
"ساغر نے جواب دیا۔ کچھ نہ پوچھو۔ ایک پرچی لگا دو"۔
راجو نے جیب سے دس کا نوٹ نکال کر دیا تو خوش ہو گیا اور لمحہ بھر رکے بغیر سڑک پار کر کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ وہ دن بھر تقریباً تمام شہر میں گھومتا تھا۔ اعظم مارکیٹ میں بھی اس کے دو تین دکاندار بڑے مداح تھے۔ انارکلی کا ہر دکاندار اسے اچھی طرح پہچانتا تھا اور وہ سارا دن شہر کا سفر کر کے لوہاری دروازے پہنچ جاتا یہ ساغر کی روحانی اور ذہنی بیداری کا بے مثال دور تھا اور وہ ہر لمحہ حرکت پذیر نظر آتا تھا۔ اس کی زندگی سراپا جدوجہد بن گئی تھی۔ وہ روزانہ تخلیق کرتا تھا۔ ہر موضوع پر اس کا ذہن منظم شعروں کے پھول کھلاتا تھا اور اس کی تخلیقات ایک روشنی کی طرح پھیلتی رہیں، ان تمام باتوں کے باوجود وہ طمع، حرص اور خوف سے قطعاً آزاد تھا۔ اسے صرف ایک دن کی ضروریات درکار ہوتیں، جنہیں کبھی وہ شعر بیچ

کر یا کسی دوست سے پوری کر لیا کرتا تھا۔

وہ اخبار مارکیٹ میں رہے یا نہ رہے، اخبار مارکیٹ والے اسے اپنے کسی نہ کسی جلسے پر کھینچ ہی لاتے۔ ایک مرتبہ اس نے جلسے میں "اخبار فروش" کے عنوان سے نظم پڑھی تو حاضرین نے جیبوں سے نوٹ نکال کر لہرا دیے۔ کسی کے ہاتھ میں ایک روپے کا اور کسی کے ہاتھ میں دس کا۔ ساغر نظم پڑھ کر سٹیج سے اترا تو اس نے جلدی جلدی پانچ سات ہاتھوں سے نوٹ وصول کیے اور باقی کو چھوڑ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ "بس اب فقیر کا دامن بھر گیا ہے"!

ناظم پان سگرٹ کے کھوکھے سے کیل کانٹے کی دکان کا مالک بن گیا تو اس نے ساغر کا روپیہ روز مقرر کر دیا ایک دن ناظم نے اٹھنی دی تو عجیب انداز میں بولا۔

"کیا لوہے سے گلا کاٹتے ہو۔ گلا کاٹنا ہے تو کاغذ کی کور سے کاٹو"!

ساغر کے نزدیک روپے کی کوئی اہمیت نہ تھی، اس کے پاس جتنے پیسے ہوتے رات کو خرچ کر کے سوتا اور صبح کے بارے میں اس کا یہ فقرہ مجھے نہیں بھول سکتا کہ۔

"صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی فقیر کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے"۔

اس کی مست الست حالت اس سطح پر پہنچ چکی تھی کہ اس کی مدہوشی ہی اس کی بیداری بن گئی تھی۔ اس زندگی میں وہ سارے مسئلے ہوش کھو کر حل کر رہا تھا اور دنیا جس کو ہوش سمجھ کر ہوشمندی کا ثبوت دے رہی تھی اس کے نزدیک ایک بہت بڑی بے ہوشی تھی۔ وہ دنیا کے کسی بھی ہونے والے واقعہ سے بے خبر نہ تھا اور اس کے علم کا ذریعہ عقل کی بجائے وجدان و ادراک تھا۔ اعلان تاشقند کے بعد جب ملک کی سیاسی زندگی میں تیز رفتار تبدیلی آئی تو وہ قلعہ لاہور کی شمالی فصیل کے سائے میں حضرت شیر شاہ ولیؒ کے مزار پر روزانہ جانے لگا اور شام کو شہر کی طرف لوٹتا۔ ایک دن میں نے سارا دن اس کے ساتھ شیر شاہ ولیؒ کے مزار پر گزارا اور مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ سارا دن شہر میں گھومنے والا ساغر شہر سے باہر کیوں چلا جاتا ہے۔ شام کو شاہی مسجد کے عقب والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے بڑے رازدارانہ

لہجے میں بتایا۔

"بڑے اہم فیصلے ہو گئے ہیں۔ کچھ حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کھونا پڑے گا، کیوں کہ کچھ باغباں بھی برق و شرر سے مل گئے ہیں۔ وزارت خارجہ سے ذوالفقار علی بھٹو کی علیحدگی کے بعد جب بھٹو صاحب پر آمریت کا عذاب نازل ہونے لگا تو ساغر نے اپنی ساری ہمدردیاں بھٹو صاحب کے لیے وقف کر دیں اور بھٹو صاحب کے بارے میں آخری بات یہی کہتا۔

نوجوان ہے۔ دیکھو نا اقوام متحدہ میں کیسی بے دھڑک باتیں کر آیا ہے۔" اگر ملے تو کہتا فقیر اسے پسند کرتا ہے"، اور پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد میں نے اسے پیپلز پارٹی کا ممبر بنانے کے لیے ممبرشپ کی رسید سامنے رکھی تو اس نے بے دھڑک ہو کر دستخط کر دیے اور کہنے لگا۔

"فقیر سیاست سے کیسے الگ رہ سکتا ہے"۔

میں نے اس کے پیپلز پارٹی کا ممبر بننے کا اعلان اخباروں میں چھپوایا تو اس نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا، لیکن ایوب خاں کے حامی اس کے مداحوں نے ساغر کی خدمت کرنا بند کر دی اور مجھے جب بھی ملتا۔ اپنے انداز میں کہتا "سناؤ بھئی پیپلز پارٹی کیا حال ہے۔

اب میں اس کے لیے یونس ادیب نہیں تھا پیپلز پارٹی تھا۔ اب اس نے سوتر منڈی کے اندر کسی زمین دوز کمرے میں بسیرا کر لیا تھا۔ یہیں سے یعقوب باوا نامی اس کا ایک مرید اس سے وابستہ ہو گیا۔ یعقوب باوا بیوی بچوں والا تھا اور سارا دن اس کے پیچھے چلا کرتا۔ ساغر نے اسے تنہائی میں سمجھایا "حضرت۔ فقیری بڑی کٹھن منزل ہے اور تمہاری فقیری تمہارے بچوں میں ہے" لیکن یعقوب باوا نے ساغر کا پیچھا نہ چھوڑا۔

عوامی تحریک زوروں پر تھی۔ بھٹو صاحب جیل میں تھے۔ ہڑتالیں، کرفیو، آنسو گیس اور پتھراؤ کے واقعات عام ہو گئے تھے۔ ساغر کبھی کبھی مال روڈ پر بھی نکل جاتا

آمریت کے خلاف جلوس نکلتے دیکھتا اور شام کو ناظم کی دکان کے سامنے ملکی حالات پر بات چیت کے دوران ساغر بھی آجاتا۔ ساغر کا سیاست کے بارے میں نظریہ مثالی تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیاستدانوں نے اس ملک کو جہنم بنایا ہوا ہے۔ وہ بھٹو صاحب کا پرجوش حامی تو نہیں تھا لیکن بھٹو صاحب کی عدل و انصاف کی باتوں سے اسے مکمل اتفاق تھا اور پھر جیسے ہی بھٹو صاحب کو ساغر نے اپنے الہام کے حوالے سے دیکھا۔ درویش نے منظوم دعا کی۔ ساغر صدیقی پہلا دانشور درویش تھا جس نے بھٹو صاحب اور عوام کے درمیان فہم کا قلبی رشتہ استوار کیا۔ میں نے یہ نظم چھاپ کر بھٹو صاحب کو بھیجی تھی۔ دعا کے اشعار یہ ہیں۔

تو کہ ہے شاہیں نظر، تیری بصیرت معتبر
پُر یقیں تیرا چلن ، تیری سیاست معتبر
تو نے خدمت کی وطن کی فہم اور ادراک سے
تجھ کو نسبت جاوداں ہے اس دیارِ پاک سے
عندلیبانِ چمن کا روپ بھر بیٹھے ہیں زاغ
تیری جرأت سے ہوئے روشن فراست کے چراغ
تیری دنیا ہے عوامی عظمتوں کی رازدار
تو ہے ملک و قوم کا بیچارگی میں غمگسار
چلچلاتی دھوپ میں تو مہرباں ثابت رہے
کامیاب و کامگار و کامراں ثابت رہے

حالات کے تبدیل ہونے سے یحییٰ خاں برسرِ اقتدار آیا اور اس کی تصویریں اخبارات وغیرہ میں شائع ہونے لگیں تو ساغر اس کی تصویر دیکھ کر پریشان سا ہو جاتا اور اپنے آپ ہی کچھ اندازے لگانے لگتا۔ اسے یحییٰ خاں پسند نہ تھا۔ پسند تو اسے ایوب خاں بھی نہیں تھا لیکن اس کی بارعب اور پرکشش شخصیت سے بڑا متاثر تھا اور ایوب خاں پر صرف اس کو اتنا اعتراض تھا کہ ایوب خاں نے جرنیل ہوتے

ہوئے اپنے ہی ملک کو فتح کر لیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشنوں میں اس نے ووٹ دینے کا پکا ارادہ کر لیا ہوا تھا۔ لیکن اسے پہلی مرتبہ یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ اس کا ووٹروں کی فہرست میں نام ہی نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں تک اس مسئلے پر رائے زنی کرتا رہا کہ دیکھو۔ فقیر کو انہوں نے اس ملک کا شہری بھی نہیں بننے دیا۔ ہاں اگر اپنا کوئی پتا ہوتا تو ہمارا بھی نام فہرست میں ہوتا۔"

ساغر کا اس شہر میں کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا اور نہ ہی اس کے نام کبھی کوئی خط آیا تھا۔ وہ کسی تحریر پر اپنے نام کے ساتھ صرف لاہور کا لفظ لکھا کرتا تھا۔ دوسرے شہروں سے بھی بہت کم مشاعروں کے دعوت نامے اس کے نام آتے تھے۔ اسے تلاش کرنے والے اکثر ناکام ہو جاتے تھے۔ میں ان دنوں نوائے وقت میں میگزین ایڈیٹر تھا۔ ادارت حمید نظامی مرحوم کے بیٹوں عارف نظامی اور شعیب نظامی کے سپرد تھی۔ اخبار کی پالیسی ایکدم اپوزیشن کے دائیں بازو کے گروپ کے حق میں بدل گئی۔ عارف نظامی نے مجھ سے اپنی اس تجویز کا ذکر کیا کہ اخبار میں ہر روز ایک سیاسی قطعہ شائع ہونا چاہیے اور یہ قطعہ کس شاعر سے لکھوایا جائے۔ ساغر کا نوائے وقت سے پرانا رشتہ تھا۔ میں نے ساغر کا نام لیا اور عارف نظامی نے تیس روپے فی قطعہ کے معاوضے کی منظوری دے دی۔ میں خوش ہو گیا کہ ساغر روزانہ ضروریات کو پورا کرنے کے کرب سے نجات حاصل کرلے گا۔ میں دفتر سے فارغ ہو کر سیدھا ساغر کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے ناظم کی دکان پر گیا تو ساغر کا کہیں پتا نہ تھا۔ ناظم نے بتایا کہ دوپہر کو گزرا تھا اور دوبارہ نہیں آیا۔ میں اس سے قطعہ لکھوا کر لے جانے کا عزم کر کے آیا تھا اور ساغر رات گئے تک نہ ملا۔ میں نے اسے سوتر منڈی کے زمین دوز کمرے سے لے کر داتا حضور کے آس پاس رات گئے تک تلاش کیا اور مایوس گھر لوٹ آیا۔ ساغر جو مجھے ہر روز کہیں نہ کہیں مل جاتا تھا اس دن کے بعد کہیں نہ ملا۔ حتیٰ کہ میں نے عارف نظامی کے سامنے ساغر سے قطعہ لکھوانے میں ناکامی کا اعتراف کر لیا اور جس روز نوائے وقت والوں نے شرقی بن شائق سے

سے قطعہ لکھوانا شروع کیا۔ اسی شام ساغر گھومتا ہوا مجھے انار کلی میں مل گیا

بڑا خستہ حال ہو رہا تھا۔ چادریں تار تار ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کی دھول اڑ رہی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ صرف سوکھے ہوئے دائیں بازو کی کہنی کے اوپر فقیروں والا کڑا تھا۔ اس حال میں مَیں نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے نوائے وقت میں اس کے قطعے کی ضرورت اور اس کے نہ ملنے کی کہانی سناؤں۔ ہم چلتے چلتے لوہاری چوک میں آگئے۔ ساغر سخت بے کیف تھا وہ چند روپوں کی تلاش کے لیے ادھر آیا تھا اور روپے اسے ملنا بہت ضروری تھے میں جانتا تھا کہ اسے اس وقت دس پندرہ روپوں کی کتنی ضرورت ہے۔ میرے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ نوائے وقت سے تنخواہ کہیں تیسرے مہینے ملتی تھی۔ یوں بھی اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا جس نے ساغر سے آکر ہاتھ ملایا، عقیدت سے سر جھکایا اور تیس روپے اس کی مٹھی میں دبا کر آگے بڑھ گیا۔ ساغر نے تیس روپوں کو والہانہ انداز میں چوما اور مجھے سوتر منڈی میں لے گیا جہاں اس نے مارفیا کے تین انجکشن لگوائے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کیپسٹن کے سگریٹ منگوائے اور جب اس کے حواس درست ہوئے اور ہم دوبارہ چوک میں آئے تو بڑے باغ و بہار موڈ میں تھا۔ ہم نے کشمیر ٹی سٹال میں چائے پی اور اس نے دو تین تازہ غزلیں سنائیں۔ میری عادت تھی کہ میں شعر سن کر فوراً لکھنے کی کرتا۔ اس رات اس نے شعر لکھوانے سے انکار کر دیا اور کہا۔ پہلے سنو۔ بعد میں میں خود لکھ دوں گا۔ چنانچہ شعر سنانے کے بعد اس نے اپنے پختہ خط میں دو غزلیں لکھ کر دیں۔ کاغذ اور قلم واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نے سنا ہے شرقی نوائے وقت میں قطعہ لکھے گا۔ خیر اچھا ہے۔ اسے ہی لکھنا چاہیے۔ بال بچے والا ہے اور بیکار ہے۔ فقیر تو صرف خدا کے سہارے زندہ ہے" کشمیر سٹال سے نکل کر اس نے مسلم مسجد کے نیچے پھول والوں سے ہار خریدے اور اچانک ایک پھل والے سے دو روپے کی ناشپاتیاں خریدنے لگا۔ اس نے چھابڑی والے

سے کہا۔ "ذرا نیک نیت ناشپاتیاں دینا۔ فقیر کے نوٹ خالص ہیں۔" اس نے ناشپاتیوں کا لفافہ بسم اللہ کہہ کر سنبھالا اور مجھے دے کر کہا۔

"گھر لے جاؤ۔ بچے کھائیں گے۔"

وہ بھاٹی دروازے تک مجھے چھوڑنے کے لیے آیا اور خود داتا حضورؒ کی درگاہ کی طرف نکل گیا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ساغر شب بسری کے پرانے مسئلے سے دوچار تھا۔ گیلانی پریس کے سلیم شاہ سے ناراضگی کے باعث اس نے گیلانی پریس کے آسیب زدہ کمرے کے کھلے دروازوں کو بھی اپنے لیے بند کر لیا تھا۔ اخبار مارکیٹ میں تجارتی توسیع نے ساغر کی چارپائی کی گنجائش ختم کر دی تھی اور انار کلی میں میجسٹک ہوٹل کے ساتھ والے درزی خانے کا شاید راستہ بھول گیا تھا۔ اس لیے لوہاری دروازے سے سردیاں آتے ہی غائب ہو گیا۔ ویسے بھی ملک الیکشنوں کے بعد شدید سیاسی افراتفری کا شکار ہو گیا تھا۔ نوائے وقت سے میرا پیشہ وارانہ رابطہ ختم ہونے سے میں نے ہیلپرز پریس کے نام سے ایک ادارہ بنا لیا اور اس میں مصروف ہو گیا۔ اس قومی بحران میں مجھے ساغر سے ملنے کا بھی بہت کم اتفاق ہوا۔ شام کو داتا حضورؒ کے مزار پر جاتے ہوئے میری نگاہیں ساغر کو ضرور تلاش کرتیں، کیونکہ داتا حضورؒ کے مزار کے جنوبی دروازے کے سامنے پانی کی سبیل تھی اور اس سبیل کے پیچھے تنگ گلی میں جوتے بنانے والوں کے کارخانے میں اس کا آنا جانا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ وہاں سے پوچھا بھی لیکن ساغر کا کوئی پتا نہ چلا۔

۱۹۷۱ء کی المناک جنگ اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ ابھی تازہ تھا کہ ساغر لوہاری دروازے میں نظر آنا شروع ہو گیا۔ اس سے کوئی بات کی جاتی تو وہ صرف ہوں ہاں کر کے چپ ہو جاتا۔ سرِ شام پاک لینڈ پریس میں آ جاتا۔ شرفو عینک ساز اس کے لیے چٹائی بچھا دیتا۔ ساغر اگربتیاں جلا کر بیٹھ جاتا اور کسی سے بات تک نہ کرتا۔ اس دوران اس نے کوئی نیا شعر نہ سنایا۔ اس کی زنبیل مستقل طور پر پاک لینڈ

پریس کے گیٹ کے پیچھے لٹکنے لگی۔ اس کے پاس بیٹھنے والے ادھر ادھر کی مارتے رہتے اور وہ کبھی کبھی ان کی طرف دیکھتا اور لب ہلا کر منہ ایک طرف کر لیتا۔ بہت دنوں بعد اس نے پاک لینڈ پریس میں قدم رکھتے ہی شرفو سے کہا۔

"ایک بازو ٹوٹ گیا ہے اور اب بھی اس کو اسلامی ملک بناؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے"۔

پھر میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"کہو حضرت! بہت دنوں بعد نظر آئے ہو"۔ حالانکہ میں اسے روزانہ پاک لینڈ پریس میں ملنے آتا تھا۔ اس نے چٹائی پر بیٹھنے سے پہلے سگریٹوں کی ڈبیا میری طرف پھینکی اور خود اپنا کمبل پھینک کر باہر چلا گیا۔ شرفو نے کہا۔

"بابا آج بولا ہے"۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں ساغر کا نظریہ سزا اور جزا کے اصول سے وضع ہوا تھا اور تمام زندگی معاشرے کی جس نفرت اور بے حسی کا وہ خود شکار ہوا تھا ساغر کے نزدیک ایک بھیانک جرم تھا، لیکن بہت مغموم تھا۔ بھٹو صاحب نے حکومت سنبھالی تو وہ ہر روز مجھ سے یہی کہنے لگا۔

"سناؤ کیا حال ہے تمہارے بھٹو کا۔ اب تو وہ صدر بن گیا ہے"۔

میں ریڈیو میں چلا گیا تو مجھے دیکھتے ہی ساغر کو اپنی رائلٹی یاد آ جاتی۔ ریڈیو سے اس کی نعتوں اور گیتوں کے ریکارڈ روزانہ نشر ہوتے تھے، لیکن اسے زندگی میں صرف ایک بار ریڈیو سے رائلٹی ملی۔ میں ریڈیو میں ایک بے اختیار رکن تھا۔ اپنے طور پر ساغر کے لیے کوئی پروگرام نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لیے چپ رہتا۔ پاک لینڈ پریس کے فٹ پاتھ پر ساغر نے محفل آرائی شروع کر دی۔ رات بھی وہاں بسر کرتا اور صبح ہی صبح وہاں سے نکل جاتا۔ کبھی کبھی دوپہر کو بھی ادھر آ نکلتا لیکن جب تک اس کا خمہ پورا نہ ہوتا لوہاری کا رخ نہ کرتا۔ نوائے وقت مجید نظامی نے لیا تھا اور ساغر ہفتے میں ایک بار کوئی نعت یا نظم لے کر جاتا تو مجید نظامی اسے پچاس روپے نذر کرتے۔ یہ پچاس روپے وہ اسی روز خرچ کر دیتا۔

ساغر کا رجحان نعت کی طرف ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی غزل یا نظم بھی لکھتا، لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیہ اشعار اس کی زندگی بن گئے تھے۔ یہ نعتیں زیادہ تر نوائے وقت میں شائع ہوتی تھیں اور حضور داتا صاحبؒ کی محبت میں اتنا سرشار تھا کہ اس نے کئی قطعے حضور داتا صاحبؒ پر لکھے اور کشف المحجوب کا پنجابی شعروں میں ترجمہ کرنے کا میرے ساتھ پروگرام بنایا۔ میرا ٹی وی میں آنا جانا شروع ہوا تو پروڈیوسر یعقوب ناسک نے میرے تعاون سے ساغر پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک شام یعقوب ناسک میرے ساتھ اسے ملنے کے لیے آیا تو وہ پاک لینڈ پریس سے شاہ عالمی کی چوہدری مینشن کی چھٹی منزل کے ایک کمرے میں منتقل ہو چکا تھا۔

یہاں کوئی بٹ صاحب طلائی سہرے بنانے کا کاروبار کرتے تھے اور ساغر کے معتقد تھے۔ میں اور یعقوب ناسک اوپر کمرے میں گئے تو ساغر موجود نہیں تھا۔ بہرحال بٹ صاحب نے ہمیں یہ کہہ کر بٹھایا کہ داتا صاحبؒ کے مزار تک گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ ساغر کے آنے سے پہلے پہلے وہاں پانچ چھ آدمی اور اسے ملنے کے لیے آگئے اور تھوڑی دیر بعد ساغر کی آواز آئی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا

"کبھی اتنی پستی اور کبھی یہ بلندی کہ چڑھتے چڑھتے دم دے دیں واہ سبحان اللہ!"

ساغر اوپر آیا تو ہانپ رہا تھا۔ اس کے حواس درست ہوئے تو میں نے ناسک کا تعارف کرایا کہ یہ ٹی وی سے آئے ہیں۔ ساغر بڑے تپاک سے ملا اور ہم کافی دیر تک ساغر کے پاس بیٹھے رہے۔ یعقوب ناسک نے دوسرے دن مجھے سکرپٹ لکھنے کے لیے کہا اور خود ہیڈ کوارٹر کے لیے منصوبہ بنانے لگا۔ ایک ہفتے بعد ہیڈ کوارٹر سے ساغر کی زندگی پر دستاویزی فلم بنانے کے لیے منظوری تو آگئی لیکن لاہور سنٹر سے کوئی کیمرہ نہ مل سکا۔ عذر یہ پیش کیا گیا کہ ان حالات میں کوئی کیمرہ اس کام کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ یعقوب ناسک کو بڑی مایوسی ہوئی اور میں نے سکرپٹ اور تصویروں کے نیگٹو لفافے میں بند کر کے "اپنے ناکام سکرپٹوں" والے ڈبے میں رکھ دیے۔

ریڈیو میں اے حمید صاحب پنجابی پروگرام "سوچاں" پیش کرنے لگے تو انہوں نے

ساغر پر ایک خاص پروگرام ترتیب دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ساغر کو ساٹھ روپے بھی مل جائیں گے اور ساغر کی آواز بھی محفوظ ہو جائے گی، کیونکہ نہ تو ریڈیو والوں نے اسے کبھی بلایا تھا اور نہ ہی خود اس نے وہاں جانا مناسب سمجھا تھا۔ میں نے ساغر سے چار نعتیں لیں اور میوزک سیکشن کے انچارج باسط صاحب کو دیں وہ ساغر کے پہلے ہی بڑے مداح تھے انہوں نے فوراً تیس تیس روپے کے حساب سے خریدنے کے لیے ریڈر رپورٹ لکھی اور پروگرام مینجر کے پاس بھیج دی۔ خواجہ عمر مرحوم نے بھی ساغر کا نام دیکھتے ہی دستخط کر دیے۔ اب ایک سو بیس روپے کا چیک وصول کرنا ساغر کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ چیک بنا پڑا تھا، لیکن ساغر ریڈیو سٹیشن کی طرف جانے کے لیے پاک لینڈ پریس سے نکلتا تو کہیں اور چلا جاتا۔ آخر شرفو بے چارہ کام آیا اور اسے صبح ہی صبح رکشہ میں بٹھا کر ریڈیو سٹیشن میں لے گیا۔ شام کو شرفو نے بتایا کہ "ابھی ابھی مرشد گئے ہیں، ایک سو بیس میں سے صرف پچیس روپے رہ گئے ہیں۔ ویسے بڑے خوش ہیں، کہتے تھے ریڈیو کے لیے اب بہت لکھیں گے۔"

پاک لینڈ پریس کے فٹ پاتھ پر ساغر کی محفلیں عروج پر تھیں کہ وہ چوک داتا صاحبؒ میں آ گیا۔ ملک تھیٹر کے پاس ایک بند دکان کے تھڑے کے نیچے کچھ خالی جگہ تھی دونوں طرف دو ہوٹل تھے، سامنے بازار تھا اور اس فٹ پاتھ پہ ساغر کا قیام بڑا پُر نور تھا اس نے کہا۔

"داتا حضورؒ کے نزدیک آ گئے ہیں۔ دیکھو نا۔ سامنے نور ہی نور ہے۔"

شام کو اس جگہ آ کر ساغر اپنا کمبل بچھاتا۔ پیچھے رکھی ہوئی دو اینٹیں لا کر درمیان میں رکھ دیتا، ان پر موم بتیاں روشن کرتا، اگربتیاں سلگاتا اور اگربتیوں کی خوشبو ساغر کی آمد کا پیغام بن کر پھیل جاتی اور اس کے گرد ہجوم جمع ہو جاتا۔ نوجوان شاعروں کی ٹولی ہر شام وہاں آتی تھی۔ ادھر ادھر ہوٹلوں میں گانوں کے ریکارڈ بج رہے ہوتے اور ادھر ساغر کی محفل میں شعر و نغمہ کے دور چل رہے ہوتے۔ میں رات کو گھر جاتے ہوئے ساغر کے پاس ضرور ٹھہرتا تھا۔ جمعرات کو فٹ پاتھ پر باقاعدہ

مشاعرہ ہوتا، مشاعرے کے بعد چائے کا دور چلتا اور ساغر کی محفل برخاست ہو جاتی۔

ساغر اپنی ذات میں ایک بھرپور محفل تھا اور اس محفل کی کہانی بہت طویل ہے، وجدان کی کہانی اور ایک جاں نثار کی کہانی۔ اس کہانی کے لیے معاشرے کے دل میں کوئی گنجائش نہ تھی، اور وہ معاشرہ اور اس کے افراد کے خول کو توڑ کر صحیح انسان کی شکل دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ وہ بھرے شہر میں تنہا ہوتا تھا اور اپنی تنہائی میں پوری کائنات سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ سجے ہوئے بازاروں میں ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح نظر آتا تھا لیکن اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا اور دیکھنے والے اس حقیقت سے بے خبر تھے۔ ایک مرتبہ سڑک کے اینٹوں کے ملبے پر بیٹھا تھا کہ کسی راہگیر نے اسے گداگر سمجھ کر چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ساغر نے عجب شان بے نیازی سے چونی سڑک پر پھینک کر کہا۔

"فقیر کی جھولی میں اپنے سانپ کیوں پھینکتے ہو۔"

اسی فٹ پاتھ پر ایک شعر نواز شخص نے اسے دیکھا اور کار کھڑی کر کے اس کے پاس آگیا۔ "ساغر صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں یہ تو فٹ پاتھ ہے۔"

ساغر نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں"

کار والے نے پوچھا۔ "مگر آپ کا گھر کہاں ہے؟"

"سارا شہر میرا گھر ہے۔ کیا مکان، کیا سرائے کیا فٹ پاتھ۔" ساغر نے جواب دیا۔

پوچھنے والے نے ایک اور سوال کر دیا۔ "آئیے میں آپ کو لے چلوں۔"

"کہاں۔؟" ساغر نے حیرت سے پوچھا۔

"جہاں آپ جانا چاہیں۔"

"لیکن میں یہاں بہت اچھا ہوں"، ساغر نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

نوبہار ہوٹل کے طیفو نے مجھے بتایا کہ ایک دوپہر ساغر بابا آیا تو اس کے پاس پانچسو روپے کے نوٹ تھے اور کہہ رہا تھا۔

"عذاب کے ریشم کا بستر بنواؤں گا۔"

ساغر نے چائے پی سگریٹ منگوائے اور بستر لینے چلا گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر واپس

آگیا۔ طیفو نے پوچھا۔

''بابا تم تو بستر لینے گئے تھے؟''

''لے لیا ہے طیفو''۔ ساغر نے جواب میں کہا۔

''مگر بستر ہے کہاں''؟ طیفو نے حیرت سے پوچھا ''اور باقی روپے کہاں ہیں''۔

ساغر نے اسے سڑک کے پار بجری پر لیٹے ہوئے کسی ننگے شخص کو دکھا کر کہا۔

''اس کو دیکھ کر بستر کا خیال ترک کر دیا اور سارے روپے اسے دے دیے ہیں''۔

ساغر صدیقی۔ درویش شاعر کی زندگی کی جھلکیاں لکھتے وقت اور بھی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔ وہ سیاہ پوش شاعر تھا نہیں سیاہ پوش کیوں بنا تھا۔ لیکن لباس سوگواری میں اس کی زندگی ایک راز کی طرح لپٹی ہوئی ہے۔

آخری دنوں میں اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ مرنے سے تو بچ گیا لیکن فالج اسے ہلا کر رکھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا ''خدا کا شکر ہے کہ ذہن بچ گیا ہے''۔

فالج اس کی سالہا سال کی اپنی ذات کی عدم حفاظت کا نتیجہ تھا۔ نرم بستر پر آنے والی نیند کے تصور تک سے آشنا نہ تھا۔ اس کا کوئی گھر ہوتا تو شاید ہفتے بعد بستر ضرور بنا لیتا۔ ویسے تو مہینے ایک ہی ملبوس میں گزر جاتے اور ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی حمام میں جا کر خوب نہاتا شیو کراتا اور رجڑے ہوئے بالوں کو کئی دنوں تک کھولتا رہتا۔ لیکن یہ عمل سال میں ایک دو مرتبہ کرتا۔ میں نے اسے کبھی پیٹ بھر کر روٹی کھاتے نہیں دیکھا۔ اچھی سے اچھی چیز کے ایک دو نوالے کھا کر مطمئن ہو جاتا۔ راہ چلتے اگر موسم کا پھل اسے نظر آجاتا تو ایک آدھ دانہ ضرور خرید لیتا اور اسے بھی تنہا نہ کھاتا۔ فالج کا حملہ اس نے صرف اپنی قوت ارادی سے پسپا کیا اور اس حملے میں اس کا دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے سُن ہو گیا۔ اس سے وہ بہت فکر مند رہنے لگا تھا کہ وہ لکھے گا کیسے۔ ہسپتالوں میں جانے کا قائل نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا ہاتھ محض پیتھوڈرین اور اٹروبین کی جعلی گولیوں کی وجہ سے بیکار ہوا ہے جو دکاندار زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی وجہ سے لوگوں کے پاس فروخت کرتے تھے۔ فالج کے حملے اور اس کے ہاتھ کے بیکار ہونے کی خبریں میں نے مساوات میں اعجاز رضوی کو دی تھی۔ یہ خبر

شائع ہوئی تو عقیدت مندوں نے پھر سات سو روپے کے قریب اس کے لیے احمد ندیم قاسمی کے پاس جمع کرا دیے۔ یہ سات سو روپے بھی اسے قسطوں میں ملے لیکن وہ پھر تازہ دم ہوگیا۔

بہت دنوں بعد پاک لینڈ پریس کے پھاٹک پر آیا تو اس نے چمکتی ہوئی سفید زنجیر کلائی کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ صاف ستھرا چہرہ اور سرمہ لگی آنکھوں کے ساتھ وہ جذبے کی بے داغ تازگی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ مفلوج ہاتھ پر اس نے نیا رومال باندھا ہوا تھا۔ تمام جاننے والے شاہ جی کے دفتری خانے کے برآمدے میں اس کے گرد بیٹھے تھے اور وہ صرف مجھ سے مخاطب تھا کہ اب اس نے زندہ رہنے کا نیا پروگرام بنایا ہے۔ پیسے مل گئے تھے۔ میں نے چار پیراہن بنا لیے ہیں۔ پیتل کا موتیوں والا کشکول خریدا ہے اور تم آؤ نا سہرے والوں کے ہاں۔ ان دنوں وہاں بستر لگا ہوا ہے۔ اس نے تازہ نعت سنائی۔

میں اعتبارِ زیست کی آنکھوں سے دیکھ لوں
بس ایک بار آپ کے روضے کی جالیاں

اس کے علاوہ اس نے بتایا کہ "ناقۂ لیلےٰ" کے نام سے ایک نیا مجموعہ کلام ترتیب دیا ہے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اٹھا اور گوالمنڈی کی طرف روانہ ہوگیا۔ گوالمنڈی کا خواجہ شفیع امرتسر کے وقت سے ہی اس کا دوست تھا۔ مداح اور عاشق تھا۔ وہ کچھ چیزیں خواجہ شفیع کے پاس بھی رکھا کرتا تھا۔ خواجہ شفیع کو اس کی فقیری نے خرید رکھا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر ہی گدی سے اٹھ کھڑا ہوتا اور یہ کہتے ہوئے دکان سے نیچے اتر آتا۔

"آؤ بابا۔ خیر ہے نا۔"

"سب خیر ہے"۔ ساغر ہمیشہ پل دو پل خواجہ کے پاس رکتا۔ کبھی طبیعت رنگ میں ہوتی تو خواجہ شفیع کی دکان کے برف والے تھڑے پر بیٹھ کر گوالمنڈی کا نظارہ کرتا۔ خواجہ شفیع کو اس کی صرف باتیں سننے کا شوق تھا اور دونوں یاروں کی طرح ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ ساغر کی غزل "چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے" مہدی حسن نے خواجہ شفیع سے لی تھی اور مہدی حسن اس سے ملاقات کے لیے ہمیشہ

تڑپتا رہا. خواجہ شفیع نے بتایا کہ ایک روز مہدی حسن جیب میں ایک ہزار روپے کے نوٹ رکھ کر خواجہ شفیع کو لے کر تلاش میں نکلا لیکن ساغر جس جگہ ملا، اس نے ملنے سے انکار کر دیا اور نہ یہ پوچھا کہ کون ہے. خواجہ شفیع اور مہدی حسن چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد کسی نے آنے والوں کا حلیہ بتایا تو ساغر سمجھ گیا کہ خواجہ تھا. اسی وقت خواجہ کی دکان پر آیا اور خواجہ نے کہا.

"جا بابا. ہم نہیں تم سے بولتے. کیسے یار ہو. ضرورت ہوتی ہے تو ملتے نہیں".

ساغر نے بے نیازی سے جواب دیا "ہم نے تو اپنے آپ سے ملنا چھوڑ دیا ہے بہر حال پانچ روپے کا نوٹ دینا".

خواجہ نے کہا "تھوڑی دیر پہلے مہدی حسن کی جیب میں تمہارے لیے ایک ہزار روپے کے نوٹ تھے."

میرے ہوتے تو تمہارے پاس چھوڑ جاتا". ساغر نے پانچ کا نوٹ لیا اور بھلا ہو کہہ کر اپنی راہ پر چل دیا.

ساغر کی راہیں اس کی اپنی راہیں تھیں اور ان راہوں پر جس پُر استقلال طریقے سے چل رہا تھا اسی کا حق تھا، اسی کا حوصلہ تھا وہ جس حوصلہ مندی سے اپنے معاشرے کے ہاتھوں اذیت پر اذیت برداشت کر رہا تھا. شجاعت کی ایک بڑی ہی گہری داستان ہے جو اپنے اندر صدیوں کے غم چھپائے ہوئے ہے.

اس دنیا سے سانس کا رشتہ ختم کرنے سے پہلے ساغر عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سراپا غرق ہو چکا تھا اور صرف نعتیں لکھ رہا تھا. اس کی ہر نعت کا ہر شعر اس کی باطنی واردات کا عکس تھا. وہ مفلوج ہاتھ سے کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے حروف لکھ رہا ہوتا تو میرا دل لرز اٹھتا اور یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا کہ یہ کیسا معاشرہ ہے کہ اس کا ایک عظیم فرد علاج بھی نہیں کروا سکتا. ساغر کو اپنے دائیں ہاتھ کے مفلوج ہونے کا بڑا دکھ تھا. وہ درد بھرے لہجے میں کہتا.

ہاتھ کو بیکار ہی ہونا تھا تو بایاں ہو جاتا".

میں نے قدرت اللہ شہاب کو ساغر کے بارے میں خط لکھا انہوں نے ساغر کے حالات پر ہمدردی کا اظہار بھی کیا، لیکن میری خواہش کے مطابق ساغر کا تاحیات وظیفہ نہ لگ سکا۔ دل نے بہت چاہا کہ مولانا کوثر نیازی کو لکھوں، لیکن اس خیال سے نہ لکھ سکا کہ ممکن ہے کہ خط ہی ان تک نہ پہنچ سکے اور اگر کچھ بھی نہ ہوا تو دل کو اور ملال ہوگا۔ میں نے ساغر کو شہاب صاحب کے خط کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔

"فقیر کی زندگی پر تبصرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اہل اقتدار لوگ ہیں اور فقیر کا معاملہ کچھ اور ہے۔"

وہ شہر کی سڑکوں پر لرزاں ترساں گھوم رہا تھا کہ اس کی بینائی اور مدھم پڑ گئی۔ آواز بند ہونا شروع ہو گئی، وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا اور اس نے سہارے کے لیے چھڑی پکڑ لی۔ دیکھنے والے چھڑی کے متعلق پوچھتے۔

"یہ کیا ہے بابا؟"

"سہارا ہے۔"

ساغر کا سہارا صرف یہی چھڑی تھی۔ روزانہ ضروریات کے لیے اس کا چلنا پھرنا ضروری تھا۔ چند قدم چلتا تو دم لینے کے لیے رک جاتا۔ بولنے کے لیے اسے جسم کی پوری طاقت استعمال کرنا پڑتی، لیکن پورے لفظ سنائی نہ دیتے اور وہ لوہاری دروازے بہت کم کم دکھائی دینے لگا۔

خواجہ شفیع نے بہت زور دیا کہ وہ اسے کسی ہسپتال میں لے جائے لیکن ساغر نہ مانا اور جب خواجہ نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو اس نے گوالمنڈی آنا چھوڑ دیا۔ خواجہ اسے تلاش کرنے کے لیے دن میں دو مرتبہ لوہاری دروازے سے بھاٹی دروازے تک چکر لگاتا۔ ساغر تھا کہ پھر غائب ہوگیا۔ ایک شام فاروق عادل میرے ساتھ تھا کہ نگی مسجد کے سامنے مل گیا۔ وہ ذہنی طور پر زندگی سے پوری طرح معمور تھا۔ اس کے ساتھ دو تین عقیدت مند تھے۔ ہم ایک بند دکان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس نے اپنی بند ہوتی آواز میں تازہ غزل پورے جوش و خروش کے ساتھ سنائی

وہ آواز بند ہونے کے جس نئے تجربے سے آشنا ہوا تھا وہ اس کے باطن کا بھی ایک مثالی تجربہ تھی اور یہ اس کا پوری کائنات میں ضم ہونے کا تجربہ ہے۔ آخری تجربہ، ذہن و شعور کی آخری منزل کا نشان اور وجدان و ادراک کی سرحدوں سے اس کے دُور نکل جانے کی گواہی ہے۔

شبِ فراق کوئی گنگنا کے گزرا ہے
کہ بن گئی ہے ستاروں کی روشنی آواز

چھننے سے پہلے اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک روپیہ طلب کیا اور مجھے اس روز پہلی مرتبہ شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں بھی اس معاشرے کا ایک حقیر ترین فرد ہوں۔ میری جیب میں بھی اس وقت سستے سگریٹوں کی ایک بمشکل ڈبی تھی۔ میری لمحہ بھر کی خاموشی سے وہ میرا حال جان گیا اور دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب ساغر دکھائی دیتا تو یوں لگتا جیسے روشنی اپنے آپ کو سمیٹ رہی ہے اور پھر یہ ٹمٹماتی روشنی بھی دوسرے تیسرے دن دکھائی دینے لگی۔ ایک دوپہر طالب چشتی گھبرایا ہوا ریڈیو سٹیشن پر آیا اور گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

"بابا ساغر خون تھوک رہا ہے اور پان گلی کے باہر منیر چھولیاں والے کے تخت پوش کے نیچے پڑا ہے۔ چلیں انہیں ہسپتال لے جائیں"۔

میں یہ خبر سُن کر کام جاری نہ رکھ سکا اور اسی وقت طالب کے ساتھ لوہاری دروازے پہنچا، لیکن ساغر وہاں نہ تھا۔ ہم نے انار کلی، پیسہ اخبار، گنپت روڈ اور لوہاری، بھاٹی کا سارا علاقہ چھان مارا اور ساغر کا کوئی نشان نہ ملا۔ شام کو میں دوبارہ لوہاری آیا تو طالب ناظم کی دکان پر کھڑا تھا۔ اس نے ساغر کو سوتر منڈی میں تلاش کر لیا تھا، لیکن اسے یہاں لانے میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ہسپتال میں ڈاکٹر اسے زہر کا ٹیکہ لگا دیں گے اور وہ اس طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہنستے بستے شہر میں اسی طرح روشنیاں ہوتی رہیں، گھروں میں خوشیوں کے چراغ روشن رہے، لیکن اس شہر، اس معاشرے اور اس ملک کی عظمتوں کے نغمے لکھنے والا

درویش شاعر خون تھوکتا رہا اور اس معاشرے اور حکومت کے ذمہ دار اداروں کا ذرا دل نہ دھڑکا۔ سچائی کی روشنی پھیلانے والا ساغر اذیت کے انتہائی لمحوں سے گزر رہا تھا۔ وہ تو شکایت بھی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب تو اسے اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ صرف اشاروں سے کچھ کہتا تھا۔ آواز نکالنے کی کوشش کرتا تو کھانسی کا شدید دورہ پڑنے سے خون پیار، حُسن اور رحم کے گیت گانے والے کے ہونٹوں سے بہہ کر زمین پر گر جاتا۔ وہ گرتا پڑتا کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاتا۔ اپنا کشکول، گدڑی اور تھیلا پتا نہیں اس نے کہاں رکھ دیا تھا، کیونکہ اب تو وہ اپنا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہ تھا۔

ناظم اس کی حالت دیکھتا تو اس کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ لیکن وہ اتنی دور جا چکا تھا کہ ایک قدم واپس نہیں آ سکتا تھا۔ چھڑی بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس چاکِ گریباں کا پھٹا پرانا کرتہ خون آلود تھا اور یوں لگتا تھا جیسے سارا زمانہ اس کے مرنے کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔

۱۸ جولائی ۱۹۷۴ء کی صبح کو اپنے چُور چُور جسم کو سوگوار روح کے ساتھ لے کر اپنے بھائی کے گھر پہنچ گیا۔ خواجہ شفیع نے بتایا کہ اسے دروازے پر دستک دینے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ وہ اپنی لاش اپنے ہاتھوں پر رکھ کر وہاں گیا تھا۔ کھڑکیوں، دروازوں اور چھتوں سے عورتیں، بچے اور مرد اس لاش کا نظارہ حیرت سے کر رہے تھے۔

ساغر کے ساتھ اس کے بھائی کے مکالمے صرف خواجہ شفیع کو یاد ہیں اور جو کچھ اس نے مجھے بتایا وہ ساغر کے ساتھ زمانے کی بے حسی اور سنگدلی کا آخری باب ہے۔ میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا اور مجھے یقین ہے کہ اگر لکھوں گا تو موروثی رشتوں کا تقدس مجروح ہو جائے گا۔

ساغر دوسرے روز ہی مر گیا اس کے بھائی نے اسے خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا۔ اور یوں غم و اندوہ کی ایک طویل داستان ختم ہو گئی۔ یہ ساغر کی کہانی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو ساغر صدیقی مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ کوئی

نئی بات نہیں جب وہ چلتا پھرتا نظر آتا تھا تو اس وقت بھی لوگ کہتے تھے ساغر مر چکا ہے۔ آج کے دور کے لوگوں کے لیے ہر وہ انسان مر چکا ہے جو خوشحالی کے منصوبے نہیں بناتا اور نہ ہی روپے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ساغر کے پاس تو جلے ہوئے جسم کے اندر خشک ہڈیوں اور تھکے ہوئے زخمی پیروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا جو دیکھنے والوں کو اس کی زندگی کا یقین دلاتا، کیونکہ دیکھنے والے کسی کی عظمت بزرگی اور زندگی کا اندازہ اس کے سماجی و معاشرتی درجے سے لگانے کے عادی ہیں۔ اس لیے ان کی آنکھیں ساغر صدیقی کے نحیف و نزار جسم سے چمٹی ہوئی بوسیدہ سیاہ چادر پر رک جاتی تھیں۔ اور ظاہری نام و نمود کی عادی آنکھیں اس ستم رسیدہ جسم کے اندر جھانک کر اس ساغر صدیقی کو کیسے دیکھ سکتی تھیں جو آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہی تو شہر میں ایک ایسا شخص تھا جس کے سینے میں ایک دلِ بے مدعا تھا اور ایک ایسا مہربان شاعر تھا جو صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز اپنے معاشرے پر احسان کر رہا تھا۔ لیکن جب وہ سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر خون تھوک رہا تھا تو ملک کے ادیبوں اور شاعروں کی جماعت کے انتخابات پر بے دریغ روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ اور آج بھی ساغر صدیقی کے بارے میں تندرست اور تر و تازہ چہروں والے دانشور یہی کہتے ہوں گے کہ ساغر اپنا قاتل آپ ہے اس لیے کہ اس نے شہرت و خوشحالی سے دامن چھڑا لیا تھا۔ وہ مسلسل بے خودی میں رہتا تھا اور اس مدہوشی میں اپنی ذات کے شعور سے عاری ہو گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ رائے ساغر کے بارے میں ایک سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ ساغر کی بے خودی اور مدہوشی پر تو ہزاروں ہوش قربان کیے جا سکتے ہیں۔ وہ کتنا بیدار اور باہوش تھا کہ اس نے فانی دنیا سے اپنے ہر تعلق کو ختم کر لیا تھا جہاں شہرت بھی ناپائیدار ہے اور دولت بھی اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ موت کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا ہو گا تو بہت خوش ہو گا۔ اس لیے کہ وہ ایک سچا شاعر تھا۔ اس کے فن اور اس کی شخصیت کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ جیسا وہ باہر سے فقیر نظر آتا تھا ویسا ہی اندر سے فقیر تھا۔

اسے اپنی فقیری پر بھی کوئی ناز نہیں تھا اور نہ ہی اپنی شاعری پر کوئی فخر۔ اس

نے تو کبھی دنیا کا شکوہ نہ کیا تھا۔ خدا سے اپنے حال کا ذکر کیسے کرتا۔ جس کسی نے
اسے کچھ دیا اس کا دل اس دینے والے کے لیے دعاؤں سے بھر گیا۔ جہاں کہیں زیادہ
خدمت کرنے والے جمع ہو گئے وہاں سے قیام ترک کر کے اپنا کشکول لیے کہیں اور
چل دیا۔ لیکن شعروں کے پھول برساتا گیا۔ لمبے لمبے خشک بالوں اور ننگے پیروں والے
ساغر کو گردن جھکائے چلتے ہوئے دیکھ کر لوگ رک جایا کرتے تھے۔ اس کے قریب
آکر پوچھتے آپ کون ہیں؟

وہ ہنس کر کہتا "جاؤ بابا ہم تو کچھ بھی نہیں ہیں" اور پھر مجھ سے کہتا بابا! "میں ان کے
سوالوں کا جواب دوں کہ اپنے سوال حل کروں۔ ان کو کیا پتا کہ فقیر آزمائش کے
موڑ پر کھڑا ہے۔"

ساغر ہر لمحہ کسی نہ کسی آزمائش کے موڑ پر کھڑا ہوتا تھا۔ ہر صبح وہ نئی زندگی کا
آغاز کرتا تھا اور اس معاشرے میں جہاں ہر انسان معاشرتی اور سماجی ضرورتوں کے
جنگل میں گھرا ہوا ہے۔ ساغر ان سب سے بے نیاز صرف اپنے ذہن کی سلامتی اور
خیالوں کی سچائی پر زندہ تھا اور وہ فیکٹریوں، دفتروں، کارخانوں اور تجارتی اداروں
کی طرف بھاگم بھاگ جانے والے لوگوں سے الگ تھلگ اپنی سوچوں کے جزیروں
میں رواں دواں ہوتا حسن و خیر کی تلاش میں اس نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور
نہ کسی ترغیب انگیز خواہش نے اس کے قدم رد کیے تھے۔ اس کا نصب العین تخلیق
تھا۔ اس کے خیال اس کی غزلیں تھے اور اس کے شعر اس کی زندگی۔

شہر کے باغ، فٹ پاتھ اور سڑکیں گواہ ہیں کہ اس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا
تھا۔ وہ کسی اپنے جیسے انسان کو کیسے دکھ دے سکتا تھا جب کہ اس نے سب کے دکھ
اپنی روح میں چھپا لیے تھے۔ اس نے پورے معاشرے کی ذلت و رسوائی اور محرومی
کو اپنی ذات کا حصّہ بنا لیا تھا اور جب طمع حرص اور خوف کے مارے ہوئے لوگوں
میں رہتے رہتے اس کا دل گھبرا جاتا تو وہ چپ ہو جاتا۔ اس کا باتیں کرنے کو دل چاہتا
تو اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا۔ زندگی کے ہر منظر میں ساغر بھرپور محبت کرنے والا

انسان نظر آتا ہے۔ پھولوں، خوشبوؤں، بادلوں اور چاند تاروں سے محبت کرنے والا انسان جو صرف محبت کرتا ہے اور کچھ طلب نہیں کرتا۔

ساغر صدیقی جو مدہوشی و مستی کی انتہاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور جسے لوگ اپنے آپ سے غافل سمجھتے تھے، سب کچھ سنتا تھا اور سب کچھ دیکھتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ صرف تماشائی تھا، گردوپیش میں جو کچھ دیکھتا تھا اس پر غور کرتا تھا اور اس کے سارے تخلیقی تجربے اس عہد کا حقیقی عکس ہیں جس میں اس نے زندگی کے سانس بہادروں کی طرح پورے کیے اور تاریک رات کے سائے کی طرح ڈھل گیا۔

اب تک جتنے بھی شہر والے ملتے ہیں مجھے ان کی آنکھوں میں ملال نظر آیا ہے اور میں نے انہیں ساغر کی موت کے دکھ میں نڈھال دیکھا ہے۔ یہ شہر والے وہ چند بے ریا لوگ ہیں جن پر ساغر کی محبت اور عظمت کے نقش بہت گہرے ہیں وہ نہیں جانتے کہ ساغر انقلابی شاعر تھا یا رومانی، رجعت پسند تھا یا ترقی پسند۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ ساغر اس شہر کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک تھا۔ شہر والے خوش ہوتے تو وہ بھی خوش ہو جاتا۔ شہر والے دکھی ہوتے تو وہ غم میں ڈوب جاتا۔ اس کا اپنا کوئی سکھ اور دکھ نہیں تھا۔ وہ تو اس شہر کا دوست تھا جس کے فٹ پاتھوں پر اس نے خیر، حسن اور روشنی کے دیے جلائے اور خود غم کے اندھیروں میں رہنا قبول کیا۔ اس لیے نہیں کہ اسے حسن اور روشنی سے نفرت تھی۔ اس کی تو ساری شاعری حسن و روشنی سے بھری ہوئی ہے۔

معاشرہ اس کی خدمات کا صلہ دے بھی کیا سکتا ہے۔ اس نے تو شاعری کے ذریعے اپنی زندگی معاشرے کو دی ہے وہ کہا کرتا تھا "بابا، اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے نہ ذہن اپنا ہے نہ خیال اپنا ہے"۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے صرف تخلیق کا کرب ننگے پاؤں تپتی ہوئی سڑکوں پر پھراتا تھا اور اعلیٰ سوچوں کی تلاش اسے پتھروں پر سلاتی تھی۔ وہ خود دکھ کے کانٹوں پر زندگی بسر کرتا رہا اور دوسروں کے لیے نغمے تلاش کرتا رہا۔ اسے زندگی سے بے پناہ محبت تھی۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ زندگی سے دور چلا گیا تھا تو مجھے ان کی عقلوں پر ترس آنے لگتا ہے، کیونکہ ساغر تو سراپا زندگی تھا اور یاسیت کی ماری ہوئی دنیا کے لیے حرکت اور توانائی

کا طاقت ور پیغام تھا۔ اس کی زندگی کی شہادت وہ خوبصورت شامیں اور پرسکون راتیں ہیں
جو میں نے اور اس شہر کے فقیر پرست لوگوں نے اس کے ساتھ داتاؒ کے بازار کے اس فٹ پاتھ
پر گزاری ہیں جہاں وہ موم بتیاں اور اگر بتیاں جلا کر زندگی اور حسن کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ان ہی
گلیوں میں اس نے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نغمے تراشے ہیں اور ملک کی عظمت و وقار
کی دعائیں کی ہیں۔ اس کی زندگی خوبصورت نغموں اور پرخلوص دعاؤں کی کہانی ہے۔ اس کے
خوبصورت نغمے اور پرخلوص دعائیں زندہ ہیں اس لیے ساغرؔ بھی زندہ ہے۔ کیونکہ وہ لوگ
ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو صداقت کے لیے ہر چیز کو فنا کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی،
اور ان کی فنا بقا بن جاتی ہے۔

یونس ادیب



خیال کا محافظ

عمر کے ساتھ ساتھ اس کا رنگ آبنوسی ہو گیا تھا۔ وہ جٹا دھاری جوگیوں کی طرح اپنے گرد کالی چادر لپیٹے دن رات لاہور کی سڑکیں ناپتا رہتا تھا۔ اس کی زندگی آوارگی، وارفتگی اور بے ترتیبی کی علامت بن کر رہ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ معاشرے اور گرد و پیش سے اس کے تمام رابطے منقطع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک طرف تو معاشرتی آداب و قوانین پر سراپا طنز ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کو خود اپنے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر تلا ہوا ہے

اس قسم کا مجموعۂ تضاد آدمی پھر مشکل ہی سے مل سکے گا کیونکہ اس کا باطن اس کے ظاہر کی ضد تھا۔ وہ اساسی اور فکری طور پر آبنوسی کیف و رنگ نہیں بلکہ شبنمی سی کی درخشندگی لیے ہوئے تھا۔ وہ اندر سے جٹا دھاری جوگی نہیں تھا۔ جدید شہری معاشرت کا ایک جیتا جاگتا کردار تھا اور سماج کے رزمیے میں ایک فعال اور جانباز سپاہی کا کردار انجام دے رہا تھا۔ اس کی آوارگی میں فلسفہ اس کی وارفتگی میں بانکپن اور اس کی بے ترتیبی میں ایک چونکا دینے والی ذہنی ترتیب پائی جاتی تھی۔ وہ معاشرتی آداب پر سراپا طنز ضرور تھا لیکن اس سے لاتعلق نہیں تھا۔ وہ اجتماعی اور معاشرتی حوالے سے ہر لحظہ اپنی ذات کو تعمیر کر رہا تھا۔

بہت عرصہ پہلے لکشمی چوک والے کنگ سرکل ہوٹل کے ساتھ مانسرور ہوٹل ہوتا تھا۔

ایک دفعہ وہ اس ہوٹل کی دوسری منزل پر کاریڈور میں پایا گیا۔ ایک کمرے کے دروازے سے اوٹ لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ساغر کیا کر رہے ہو؟ اور اس نے میری طرف دیکھ کر بڑے سکون سے جواب دیا "خیال کی حفاظت کر رہا ہوں"۔ ہمارے کرپٹ اور بگٹٹ معاشرے میں تو لوگ اپنے جسم تک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ایسے حالات میں جو شخص اپنے خیال اور اپنے ارادے کی حفاظت کر رہا تھا وہ یقیناً کوئی عام اور نجی آدمی نہیں تھا۔ ساغر کو دیکھ کر اس کے دوست کہتے تھے کہ اس مرد درویش میں SENCE OF POSSESSION

بالکل ہے ہی نہیں لیکن جس دن اس نے بتایا کہ وہ خیال کی حفاظت کر رہا ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس شخص کی حس متاع عام لوگوں سے زیادہ بیدار ہے جو شخص کاروں اور حویلیوں کی بجائے خیال ارادہ اور نظریہ رکھتا ہو دنیا کا سب سے زیادہ مالدار اور صاحب سرمایہ ہوتا ہے۔ کاریگر اور صناع طبقہ تاریخ انسانی میں ایک خاص تخلیقی مقام رکھتا ہے۔ اس طبقہ نے تاریخ عالم میں بڑے بڑے مکاتیب فکر پیدا کیے ہیں اور بڑی بڑی انقلابی تحریکوں کو جنم دیا ہے ان کو پرچم کشائی کے لیے اگر دیرو ہر نیاں نصیب نہ ہو تو یہ طبقہ "کاوے" کی طرح اپنی چمڑے کی دھونکنی کو جھنڈا بنا کر انقلاب بپا کر دیتے ہیں۔ ساغر صدیقی جماعتی طور پر صناع اور کاریگر طبقے کا فرد تھا۔ اوائل عمر میں شانہ ساز تھا۔ بعد میں گیسوئے اردو کی مشاطگی کے فن سے مشہور رہوا۔ امرتسر برصغیر کے ان گنے چنے شہروں میں سے تھا جس کی خاک سے بڑے بڑے جلیل القدر اہل قلم پیدا ہوئے اور وابستہ رہے۔ ظفری مرحوم اور شمس پنائی مرحوم اسی عروس البلاد کے ماتھے کا جھومر تھے۔ ابوالکلام آزاد، منٹو، باری اور دوسرے کئی ممتاز اہل فن کو اس دیار سے نسبت خاص رہی۔

تقسیم ملک سے چند سال پہلے امرتسر میں فرخ مرحوم کی بزم مروش کا طوطی بولتا تھا اس بزم میں ہر طبقہ اور جماعت کے اہل فن اور سخن شناس باقاعدگی سے جمع ہوتے اور ہنگامۂ شعر و سخن بپا کرتے۔ اس محفل شعر و سخن میں کاریگر اور صناع سخنوروں کا خاص حصّہ تھا جن میں سرفراز ایسے منجھے ہوئے شاعر بھی شامل تھے۔ ساغر اس وقت صغر سنی سے بڑھ کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا اور اسی گروہ کاریگراں کے ہمراہ مشاعروں میں شامل ہوا کرتا تھا اس کے دوسرے ساتھی چونکہ سب کے سب عمر میں اس سے بڑے تھے اس لیے ان کے رنگ غزل میں قدامت کی جھلک ہوتی تھی لیکن ساغر صدیقی جو سب سے کم عمر تھا اپنی افتاد طبع کے باعث جدت پسندی میں یقین رکھتا تھا چنانچہ جوں جوں وقت گزرا ساغر کا جذبۂ جدت پسندی نکھرتا چلا گیا اور وہ زبان و فکر کے اعتبار سے ایک خوبصورت اچھوتے اور ترقی پسندانہ آہنگ کا خالق بن گیا۔

لاہور والا ساغر امرتسر والے ساغر سے بہت مختلف تھا امرتسر والے ساغر میں ذہنی ترتیب و نظم کم اور ظاہری ترتیب و نظم زیادہ تھی۔ لیکن لاہور والے ساغر میں ذہنی ترتیب

نظم کی فراوانی تھی لیکن ظاہری ترتیب و نظم کا احساس مٹ چکا تھا وہ دراصل اپنے ظاہر کو مسمار کر کے اپنے باطن کو تعمیر کر رہا تھا اور اپنے باطنی ارتقاء سے انکشافِ ذات کا کام لینا چاہتا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے نشہ کی لت لے ڈوبی۔ ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اسے آخر نشے کے ذریعے اپنے اندر اضافی ہیجان پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ آدمی کو زندہ رہنے کے لیے ہر قدم پر زندگی آموز ہیجانات اور SENSATION کی تلاش ہوتی ہے اگر یہ ہیجانات اور SENSATION ختم ہو جائیں تو آدمی کا بیرونی دنیا سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ساغر صدیقی کو اس بے رحم معاشرے نے تنہا بنا دیا تھا۔ اسی لیے وہ نشے کا عارضی سہارا لے کر اپنی جلوت آپ آباد کر لیتا تھا۔ وہ آدمی سخت جان تھا کہ تنہائی کی مار کھا کر بھی اس کی معاشرتی مطالعے کی آنکھ کبھی بند نہ ہوئی اور وہ معاشرہ جس نے اسے اٹھا کر تنہائی کے صحرا میں پھینک دیا وہ اس کے لیے ترقی پسندانہ خاکے اور زائچے ترتیب دیتا رہا اور اپنے آخری سانسوں تک اس کی سربلندی اور خوش بختی کے گیت گاتا رہا۔

ساغر صدیقی بنیادی طور پر غزل کے میدان کا شہسوار تھا وہ عموماً چھوٹی اور کانوں میں رس گھول دینے والی بحروں کا انتخاب کرتا وہ خوبصورت لفظوں اور ترکیبوں کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرتا اس کے خیال آسان اور برجستہ ہوتے اور اس کے شعروں کا تاثر دلوں پر فوری اور براہِ راست ہوتا۔ اس کی غزلوں میں زندگی چہکتی اور مہکتی نظر آتی وہ جلال اور جمال دونوں کا شاعر تھا۔ وہ مرتی ہوئی سماجی قوتوں کا نوحہ گر نہیں، نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں کا نغمہ گر تھا۔

ایک دفعہ وہ ملتان کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے بس پر سوار ہوا۔ چونگی کے پاس بس پہنچی تو اس کا ذہن یکایک بدل گیا وہ ضروری کام کے بہانے بس سے اتر کر کہیں ادھر ادھر غائب ہو گیا لیکن آج جب کارکنانِ قضا و قدر اسے بلانے آئے تو وہ کسی بہانے بھی چلتی ہوئی بس سے نہ اتر سکا '''' اور اپنا متاعِ سخن ہمارے حوالے کر کے بلانے والوں کے ساتھ چپ چاپ چلا گیا۔

ظہیر کاشمیری

چراغِ زندگی

ہستی کائنات یا کائناتِ ہستی میں زندگی کو تابناک رکھنے کے لیے جتنے چراغ روشن ہوئے ان میں ساغر صدیقی کا نام نامی بھی تھا اور جس طرح چراغ کی روشنی سے سب فیضیاب ہوتے ہیں، سوائے چمگادڑوں کے لیکن چراغ سے سب دامن بچاتے ہیں، سوائے پروانوں کے۔ اسی طرح ساغر صدیقی سے بھی بعض لوگ دامن بچاتے رہے اور اسے یہ شعر کہنا پڑا کہ۔

تری محفل میں ساغر سا بھی کوئی اجنبی ہوگا
یہ ظالم ایک مدت سے ترا اپنا ہے نہ بیگانہ

اور جو ایک دامن کے جھونکے کو یوں زندگی بھر ترسا کیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ۔

چراغِ زندگی کو ایک جھونکے کی ضرورت ہے
تمہیں میری قسم ہے پھر ذرا دامن کو لہرانا

یہ شخص بھی اگر کوہکن کی طرح برگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہوتا تو تیشے کی ضرورت مرنے کے لیے اسے بھی پڑتی، لیکن جو لوگ زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، ان کا مسلک زیادہ تر زندگی کی ان رسموں کی خلاف ورزی کرنا ہوتا ہے۔ جن کے قاتل فرہاد جیسے عاشق ہوتے ہیں۔ جو کسی ایک ہی شیریں کے لیے جوئے شیر لاتے ہیں۔ ساغر صدیقی ترکِ رسومات کا اس درجہ قائل تھا کہ اس کے دنیا سے اٹھ جانے پر ریڈیو پاکستان لاہور سے اظہار حسین کاظمی صاحب کی نگرانی میں جو پروگرام نشر ہوا اس کا اعلان بھی غیر رسمی تھا۔ اعلان یہ تھا کہ۔ میر تقی میر نے اپنے زمانے کے شعراء کے تذکرے میں ایک شاعر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ: "عریانی را جامہ می کرد در ہمہ عریانی جامہ یافت۔" ہمارے آپ کے زمانے میں بھی ایک ایسا ہی شاعر کل تک تھا۔" سنا ہے۔ کل رات مر گیا وہ۔! یعنی ساغر صدیقی۔! اور اس اعلان کے بعد ساغر صدیقی کی وہ مقبول نعت کہ ”حق کا پیغام سنانے کے لیے آپؐ آئے۔ جو بخشی سلامت قوال اور ان

کے ساتھیوں نے پوری جان لڑا کر پیش کی ہے۔ انتہر ہوئی تو محسوس ہوا کہ یہ شخص کتنا دنیاوی رسوم و قیود سے بیگانہ تھا کہ ریڈیو والوں کو بھی اپنے عام اعلانات سے ہٹ کر اس شخص کے لیے ایک خاص اعلان کرنا پڑا۔!

جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے پاکستان میں مارشل لاء نافذ کر کے بزعمِ خود زرعی اصلاحات نافذ کیں اور ہر شاعر و ادیب کو یہ حکم ملا کہ وہ ان زرعی اصلاحات کے گیت گائے تو ایک مشاعرہ لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہوا جس میں سب شاعروں نے اس حکم کی بجا آوری میں ان نام نہاد زرعی اصلاحات کو سراہا اور جب لوگ کہیں سے ساغر صدیقی کو ایک چادر میں لپیٹ کر لے آئے اور انہیں روشنی اور مائکروفون کے سامنے کر دیا تو انہوں نے اپنی غزل کے اس شعر پر چادر اتار کر میرِ مشاعرہ پر پھینک دی کہ ؎

مجھے وطن کے غریبوں کو ڈھانپنے کے لیے
قبائے خواجۂ اقلیم کی ضرورت ہے

اور مشاعرہ فرش سے اڑ کر عرش پر جا پہنچا۔ اس غزل میں اس وقت کے حکمران ٹولے کو ساغر صدیقی نے بتایا تھا کہ عوام کو اس نام نہاد زرعی اصلاح کی نہیں اصل میں کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ ساغر صدیقی قیس و فرہاد کی مانند کسی ایک لیلٰے یا کسی ایک شیریں کا نہیں پوری انسانیت کا عاشق تھا۔ اسی لیے وہ اپنی بظاہر بے بضاعتی کے باوجود ہر جابر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا تھا اور اس طرح سوچتا کہ ؎

سربلند اپنا لہو تھا سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے

ہر چند کہ یہ شعر ساغر صدیقی کا نہیں ہے لیکن اس تیور کے بے شمار اشعار اس کے دیوانوں میں آپ کو مل جائیں گے۔ "غمِ بہار" اور "لوحِ جنوں" ہیں۔!

وہ دریار پہ ہو تو اتنا امن پسند شہری ہوتا کہ کہتا ہے۔

؎ میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

لیکن کسی جابر حاکم کے سامنے ہو تو پھر منصور کی طرح انا الحق کا نعرہ بلند کرتا ہے اور کسی لالچ یا دھمکی کی پروا نہیں کرتا۔

عریانی کے لباس میں لاہور کے داتا گنج بخشؒ کے مزار کے پیچھے کے میدان میں فقیروں میں پڑا رہنے والا یہ مجذوب شاعر انسانیت کی فلاح و بہبود کے جو خواب زندگی بھر دیکھتا رہا ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے والا اگر کوئی مل جاتا تو یہ دنیا اب تک جنت کا نمونہ ہو چکی ہوتی۔ شاعر خواب ہی دیکھ سکتا ہے چہ کند بے نوا ہمی دارد۔ وہ کہتا رہا کہ ؎

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

اور ؎

بنام زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

یا ؎

جسے زبان خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ بڑا اندھیرا ہے

وغیرہ۔ لیکن کسی نے جیتے جی اس کی صدا پر کان نہ دھرا، اور اس کی زندگی میں اس کی ہر صدا، صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اب مرنے کے بعد لوگ اس پر مضمون لکھنے بیٹھے ہیں ہر انسان دوست کے ساتھ اس دشمن دنیا نے یہی سلوک روا رکھا ہے۔

وہ جب کہتا تھا کہ ؎

محبت کے مزاروں تک چلیں گے
ذرا پی لیں ستاروں تک چلیں گے

تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ چرس کا دم بھرنے والا اور داتا گنج بخشؒ کے مزار کے پیچھے کے میدان میں فقیروں میں ننگ دھڑنگ پڑا رہنے والا مجذوب بھلا کیا ستاروں تک پہنچ سکے گا۔ لیکن اب جب وہ ستاروں سے آگے نکل گیا تو سب دم بخود ہیں۔

لاہور کی ایک سڑک کا ابھی تک پرانا نام چل رہا ہے بیڈن روڈ۔ اس بیڈن روڈ پر تین ٹھکانے ایسے تھے جن میں سے ایک تا حال قائم ہے۔ "جالندھر سویٹ مارٹ" جہاں صبح شام ادیبوں شاعروں اور سیاست دانوں کا جمگھٹ رہتا ہے۔ پہلے دو ٹھکانے تھے "ستارہ شو کمپنی" اور "شیریں جنرل سٹور" ان دو ٹھکانوں میں سے ستارہ شو کمپنی کے مالک شیخ محمد شریف صاحب کو جب سولہ ہزار روپے کا کلیم ملا تو انہوں نے سوچا کہ ساغر صدیقی کے اعزاز میں یہ سولہ ہزار روپے خرچ کر دیے جائیں تاکہ شاعروں اور ادیبوں کی قدر دانی صرف زبانی جمع خرچ تک ہی نہ رہے۔ ان کے دواوین اچھے کاغذ پر چھپوائے جائیں، عبدالرحمن چغتائی، صادقین یا شاکر علی جیسے مصوروں سے ان کے کلام کے مجموعوں کے سرورق بنوائے جائیں اور کسی پانچ ستاروں والے ہوٹل میں ان کے اعزاز میں ایک شام منانے کا اہتمام کیا جائے لیکن ساغر صدیقی صاحب نے ان باتوں کو رسمی گردانا اور بہار کے شیخ محمد شریف مالک سابق ستارہ شو کمپنی بیڈن روڈ لاہور نے اس کلیم کے سولہ ہزار روپے سے اپنی والدہ محترمہ کے نام پر لاہور کے ایک ہومیو پیتھک ہسپتال میں خیراتی وارڈ بنوا دیا "جنت بی بی وارڈ" کے نام سے۔ پھر بیڈن روڈ لاہور کے شیریں جنرل سٹور کے مالک شیخ آفتاب احمد نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ساغر صدیقی ان کے گھر مستقل مہمان رہنا قبول کریں اور روٹی، کپڑے اور مکان کی طرف سے نچنت ہو جائیں لیکن ساغر صدیقی کا کہنا تھا کہ جب تک دنیا میں ایک بھی ننگا، بھوکا اور بے آسرا انسان موجود ہے میں کیسے اپنے لیے یہ سب چیزیں قبول کر لوں۔ رانا حبیب صاحب بیڈن روڈ کے تیسرے ادبی اڈے یعنی جالندھر سویٹ مارٹ والے تک ساغر صدیقی اس لیے نہیں پہنچے کہ وہ مٹھائی کی دکان ہے اور جب تک ساری دنیا کے انسانوں کے لیے روٹی، کپڑے اور مکان کا انتظام نہ ہو جائے وہ مٹھائی کی دکان میں کیسے جا بیٹھیں، حالانکہ جناب ظہیر کاشمیری نے بارہا کہا کہ ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مگس و مور و ملخ گرد آیند

لیکن ساغر صدیقی نہ مگس تھا نہ مور نہ ملخ۔ اس لیے اس کے کان پر اس شعر کے پڑھنے سے کوئی جوں نہ رینگی۔

ساغر صدیقی کی آنکھوں پر دیدہ یعقوب کی سفیدی پھر چکی تھی اور بقول خلیل جبران وہ زندگی کے اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں داؤد کے نغمے یعقوب کے نوحے معلوم ہوتے ہیں پھر بھی دل کے بہلانے کو اپنے نہیں دوسروں کے، وہ ایسے شعر بھی کبھی کبھی کہہ دیتا ۔

خیالِ یار میں ہم پُر بہار رہتے ہیں
خزاں کے دن بھی ہمیں سازگار رہتے ہیں

وہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کی سفیدی سے وہ وہ دُکھ دیکھ لیتا تھا جو بھنوروں جیسی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی سے لوگ محسوس نہیں کرتے۔ اس کی شاعرانہ بصیرت نے اس کی آنکھوں کے سفید ڈیلوں میں وہ بصارت پیدا کر دی تھی جس کے لیے غالب نے فارسی میں یوں کہا کہ اس دنیا میں اتنے دکھ بکھرے پڑے ہیں کہ آپ ان دکھوں کو ننگی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے، اگر آپ صاحبِ بصیرت ہیں تو۔ اور یہ جو پیمانے میں نشان ہیں یہ اصل میں آپ کی عینک کے نمبر ہیں کہ کس نمبر کی عینک سے آپ یہ دُکھ دیکھ سکتے ہیں۔ ساغر صدیقی کو اس دنیا میں اتنے دکھ نظر آئے کہ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں ہی چھپا لیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو اسے نابینا ہی گرداننے لگے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ ۔

زلف آوارہ، گریباں چاک، گھبرائی نظر
ان دنوں یہ ہے جہاں میں زندگانی کا نظام

تو ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں اور لوگوں نے سمجھا کہ چرس اُسے پی گئی، حالانکہ وہ آخری دم تک کہتا رہا کہ ۔

ایک نغمہ، ایک تارا، ایک غنچہ، ایک جام
اے غمِ دوراں، غمِ دوراں تجھے میرا سلام

اخلاق احمد دہلوی

فرازِ عرش کا ٹوٹا ہوا تارہ

—— میرزا ادیب ——

ہال کے بڑے دروازے کے سامنے ایک خوبصورت کار آ کر رکی۔ مشاعرے کے منتظم نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ جو صاحب کار میں سے نکلے انہیں بڑی عزت و احترام کے ساتھ ہال کے اندر پڑی ہوئی ایک اونچی کرسی تک پہنچا دیا گیا۔

معلوم ہوا یہ ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

دو تین منٹ بعد ایک صاحب آئے۔ ان کے اردگرد عقیدتمندوں اور مداحوں کا ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔ مشاعرے کے منتظم انہیں بھی بہت عزت و احترام کے ساتھ اندر لے گئے۔

وقفے وقفے بعد شاعر آتے گئے اور ہال کی اونچی کرسیوں کے نصیب جاگتے گئے۔

اسی اثنا میں ایک سانولے رنگ کا آدمی آیا۔ شانوں پر سیاہ چادر، بال بکھرے ہوئے، ننگے سر، ننگے بدن، چہرے پر گرد و غبار کی کافی موٹی تہ جمی ہوئی، آنکھیں شب بیداری سے سوجی ہوئیں اور ٹانگیں لڑکھڑاتی ہوئیں۔

منتظم نے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور جیب سے لائٹر نکال کر اپنا سگریٹ سلگانے لگا۔

کئی لوگوں نے اسے دیکھا۔ بعضوں نے منہ پھیر لیے۔ بعض اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ دو تین شخصوں نے ازراہِ رحم اس سے خیریت دریافت کی۔ اس کا جواب تھا۔

"فقیروں کا حال اچھا ہے۔"

فقیر اندر چلا گیا۔ سب نے اسے دیکھا مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔

وہ سب سے آخری کرسی پر بیٹھ گیا اور جلد ہی بیزار ہو کر یا گھبرا کر ہال سے باہر نکل گیا کسی نے بھی اسے روکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

میں سوچتا ہوں اگر یہ فقیر سید انشا اللہ خاں کا ڈھنگ نباہتا تو لوگوں سے ضرور پوچھتا۔

"کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟"

لوگ جواب دیتے "جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں، سب آجائیں تو شروع ہو۔"

صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ جیب میں دوبارہ ہاتھ ڈالتا ایک پھٹا پرانا کاغذ نکالتا اور غزل پڑھنی شروع کر دیتا۔

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمہاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

فقیر غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلا جاتا۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا چھا جاتا۔ اور دیر تک دلوں میں ایک عالم رہتا۔ لیکن یہ سب کچھ تو اس وقت ہوتا جب فقیر انشا اللہ خاں انشا کا

ڈھنگ اپناتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایک منٹ میں آیا اور دوسرے منٹ میں چلا گیا۔

یہ فقیر جو آج فرازِ عرش کا ایک ٹوٹا ہوا تارا ہے۔ ایک زمانے میں اپنی بلندیوں پر پوری تابناکیوں سے جلوہ ریز نظر آتا تھا۔

قیامِ پاکستان سے کئی برس پہلے کی بات ہے مجھے میرے دوست ظہور الحسن ڈار نے امرتسر پہنچنے کی دعوت دی اور لکھا کہ کل یہاں ایک بڑا شاندار مشاعرہ ہو رہا ہے۔

میں مشاعرے میں پہنچ گیا۔ لوگ آ کر بیٹھ رہے تھے۔ شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے کسی کو داد مل رہی تھی کسی پر ہیدا ہو رہی تھی۔ اتنے میں سٹیج سیکرٹری نے کہا۔

"اب ساغر صدیقی صاحب تشریف لائیں گے"

یہ اعلان سنتے ہی فضا میں مکمل سکوت چھا گیا۔ سب کی نظریں سٹیج کی طرف اُٹھ گئیں۔

ایک پتلا دبلا سالولے رنگ کا نوجوان سٹیج کی طرف بڑھا۔ اس وقت ایک بھی نظر ایسی نہیں تھی جو اس کے چہرے پر مرتکز نہیں تھی۔

وہ سٹیج پر آ گیا تالیاں بجیں، دیر تک بجتی رہیں۔ سانولے رنگ کے نوجوان نے ایسے ترنم سے غزل سنائی کہ سارے مجمع پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ غزل خوبصورت تھی مگر جس ترنم سے سنائی گئی اس کا جواب ہی نہیں تھا۔

حاضرین نے اصرار کیا کہ ایک اور غزل سنائی جائے۔ ایک اور غزل سنا دی گئی اصرار پھر بڑھا نوجوان نے تیسری غزل بھی سنا دی۔ اصرار اب بھی تھا۔ مگر میر مشاعرہ نے یہ سوچ کر کہ پبلک کا پُرزور اصرار کبھی ختم ہو گا ہی نہیں، نئے شاعر کو بلوا لیا اور نوجوان شاعر واپس چلا گیا۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب تارا فرازِ عرش پر بڑی آن بان سے ضو فشاں تھا۔ اس دور میں ساغر صدیقی مشاعروں کی آبرو تھا۔ کوئی مشاعرہ اس کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ تارا ٹوٹا تو دنیا کا رنگ ہی بدل گیا۔

تارا ٹوٹتا ہے تو لوگ اسے دیکھ بھی لیتے ہیں اور کبھی کبھی سوچ بھی لیتے ہیں۔ مگر یہ بات تو غالباً کسی نے بھی نہیں سوچی ہو گی کہ اب اس ٹوٹے ہوئے تارے کا کیا ہو گا؟

ٹوٹے ہوئے تارے کا کیا ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سڑکوں پر ایک سانولے رنگ کے آدمی کو سیاہ

چادر اوڑھے، بال بکھرائے ننگے سر، ننگے پاؤں گھومتے ہوئے نہیں دیکھا؟

یاروں نے کہا۔ ساغر صاحب، گھر بنائیے! ساغر نے جواب دیا فقیروں کا گھر تو ساری کائنات ہے مگر یار کب مانتے تھے۔ ساغر نے موہنی روڈ پر راعیں بلڈنگ کے قریب گھر بنا لیا گھر کیا تھا، ایک کوٹھڑی تھی اور ایسی کوٹھڑی کہ "دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے"! اتفاق سے ساغر میرا ہمسایہ بن گیا تھا ایک دن میں اس کے گھر گیا۔ پھٹی پرانی دری پر ساغر دو تین دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پاس چار اینٹوں نے چولہے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک ٹوٹا ہوا گلاس بھی پڑا تھا۔ کچھ جلی ہوئی تیلیاں، کچھ بکھرے ہوئے کاغذ اور ایک اینٹ پر ایک چھوڑ چار موم بتیاں۔

"ساغر صاحب یہ! یہ موم بتیاں"!

میرزا صاحب! یہاں شب کو چراغاں ہوتا ہے۔ آیئے آج دیکھئے۔

اور میں نے چراغوں کی بہار بھی دیکھ لی۔ دروازے کے باہر ہی سے جھانک کر دیکھا ساغر تنہا خاموش فکرِ سخن میں مبتلا بیٹھا تھا۔ چاروں موم بتیوں کی روشنی ایک مدھم سے حلقۂ نور میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا اور واپس گھر آ گیا۔

سنا ہے جب رانجھے نے دیارِ ہیر میں دھونی دھمائی تھی تو اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ پھر اس موم بتیاں جلانے والے فقیر کی شہرت کیوں نہ پھیلی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دل خوفزدہ ہو گئے۔ کوٹھڑی کے مالک کو پریشان کیا جانے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن فقیر کا سامان کوٹھڑی سے باہر پڑا تھا۔ فقیر اس وقت اپنے گھر سے دور کسی جگہ اطمینان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسے کیا خبر تھی۔

ہم ہیں ویرانے میں اور گھر میں بہار آئی ہے

فقیر آیا دری لپیٹی، جھولی میں ماچس اور گلاس ڈالا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متردد ہو گیا۔ موم بتیاں غائب تھیں۔ لیکن اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کا تردد دور ہو گیا اور وہ حاضرین کو سلام کر کے نہ جانے کس منزل کی طرف رواں ہو گیا۔

اس تجربے کے بعد ساغر نے کبھی گھر نہیں بنایا۔ دن کو لاہور کی سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ کسی رات فٹ پاتھ پر بستر لگاتا تو کسی رات دکان کے تختے پر سو جاتا۔ کہنے والے کہتے ہیں ساغر دیوانہ ہے۔ وہ دیوانہ ہی ہو گا لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ دیوانہ دو معاملات میں انتہائی

فرزانہ تھا۔ایک معاملہ تو سخن گوئی کا ہے۔ اتنی فرزانگی اور ہوشمندی سے شعر کہتا کہ حیرت ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی شعر گوئی بھی ایک دیوانگی ہے۔ مگر ایسی دیوانگی جس کے متعلق تاثیر مرحوم نے کہا ہے۔

اُف وادیٔ جنوں کے وہ پُرپیچ راستے

دیوانگی کو بھی کوئی فرزانہ چاہیئے

فرزانگی کا دوسرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے ۔ اور کسی نے بھی آج تک ساغر صدیقی کی زبان سے کوئی فحش بات نہیں سنی۔ بُرا بھلا کہنا وہ جانتا ہی نہیں ہر ایک کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے کچھ طلب بھی کر لیتا تھا۔ یہاں بھی اس کی فرزانگی ملاحظہ فرمائیے۔ چار آنے مانگنے پر آپ آٹھ آنے یا ایک روپیہ دے دیں تو وہ چار آنے لے کر باقی سکے واپس کر دیتا۔ یہ اس دیوانے کا اصول تھا۔

میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میری نظروں کے سامنے ایک سڑک پر سانولے رنگ کا آدمی سیاہ چادر اوڑھے، بال بکھرے، گریبان کھولے، ننگے سر، ننگے پاؤں، اپنے حال میں مست دیوانہ وار پھرتا نظر آ رہا ہے۔ آپ نے بھی کبھی اس فقیر کو ضرور دیکھا ہوگا۔

جب ساغر گردش میں نہیں تھا!

سعید قیس

یہ ان دنوں کی بات ہے

جب ساغر گردش میں نہیں تھا اور لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اس کی شعری تخلیقات کا سحر چھایا ہوا تھا۔ نیا نیا پاکستان بنا تھا اور ساغر بھی نئی زندگی اور نئے مستقبل کی امیدوں کے ساتھ امرتسر سے لاہور آیا تھا۔ یونس ادیب اور میں سڑکوں پر گھوم رہے ہوتے تو وہ کہیں نہ کہیں مل جاتا۔ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل تک شام ہو جاتی اور میں اس سے مل کر گھر جا رہا ہوتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے ساغر انجانی سوچوں کے ساتھ نامعلوم منزلوں کی جانب سفر کا آغاز کر چکا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا شعری شعور بیداری کی اس حالت میں تھا کہ بعض اوقات اس کے شعروں کی گہرائیوں میں جھانکنے سے مجھے یونس ادیب سے اتفاق کرنا پڑتا کہ ساغر کی انجانی سوچیں اور نامعلوم منزلوں کی طرف اس کا ارادۂ سفر زندگی کی ان ٹھوس حقیقتوں کے انکشاف کا ردعمل ہے۔ جنہیں وہ اپنے فنی خلوص سے دیکھنے کا متمنی تھا اور یہ بالکل درست ہے کیوں کہ زندگی جن ٹھوس حقیقتوں کے ساتھ اسے ملی تھی۔ ساغر نے گہرے احساس کے ساتھ انہیں قبول کیا تھا اور ان کے اظہار کے لیے اس نے شعر کا ذریعہ اختیار کیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد جس افراتفری کے ماحول میں اس نے تخلیقی عمل شروع کیا تھا۔ وہ منافقت سے بھرا ہوا تھا اور ساغر ایسے حساس اور باشعور تخلیق کار پر اس کا اثر ہونا لازمی تھا وہ حسن، خیر اور سچائی کے گیت لے کر پاکستان آیا۔ لیکن اس نے طمع، حرص اور خوف سے بھری ہوئی دنیا سے دامن بچانا شروع کر دیا تھا۔

بحرین میں کبھی کبھار اردو رسالوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے ساغر کی کوئی غزل نظر سے گزرتی تو اس کے ساتھ گزرا ہوا زمانہ یاد آجاتا۔ مجھے اس کے حالات اور ذہنی تبدیلیوں کی تصویریں

اس کے شعروں میں نظر آجاتی تھیں۔ اس کے حالات اور ذہنی تبدیلیوں میں بڑا فرق تھا وہ اپنے حالات میں دنیا کا انتہائی بے بس انسان دکھائی دیتا لیکن ذہنی تبدیلیوں کی دنیا میں وہ احساس اور خیال کا بادشاہ نظر آتا۔

ایسا کیوں تھا؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور جب میں بارہ سال بعد بحرین سے پاکستان آیا تو میں نے ادیب بابا سے کہا کہ ساغر سے ملاؤ۔ پھر دونوں سارا دن اسے باغوں، مزاروں فٹ پاتھوں اور تنگ و تاریک ہوٹلوں میں تلاش کرتے رہے اور رات گئے گھر جانے لگے تو ہسپتال روڈ کے ناکے پر ساغر مل گیا۔ لیکن یہ وہ ساغر نہیں تھا، جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال لٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں انجانی منزلوں کی تلاش کی دھول تھی اس نے اپنے نحیف و نزار جسم کو پھٹی پرانی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا اور اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

ساغر کی زندگی پہ کوئی تبصرہ نہ کر!

اک شمع جل رہی ہے، سرِ راہ گزارِ زیست

وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور اس نے شعر سنانے شروع کر دیئے۔ میں جتنے دن بھی لاہور رہا ساغر سے ہر روز سرکلر روڈ پر ملاقات ہو جاتی۔ اس کا فنی خلوص پہلے سے بھی زیادہ تازہ اور فکر انگیز تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ سے بے نیاز تھا اور اس کی بے نیازی کی داستانیں بہت طویل ہیں، جو شہر لاہور میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں اور میں اس کے انتقال کے چند روز بعد دوبارہ لاہور آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شہر اس روشنی سے محروم ہو گیا ہے جسے زمانے نے خود ہی نگل لیا ہے۔

ساغر ہمارے دور کا ایک ایسا شاعر تھا، جس نے اپنے دکھ بھول کر اپنے عہد کے دکھوں کو سینے سے لگایا تھا اور ہر طرف اس کے انتقال پر رنج والم کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس کی عظمت کا اعتراف کرنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اس کی زندگی میں اس کے متعلق لمحہ بھر کے لیے بھی نہ سوچا کہ زندہ رہنے کا اسے بھی حق تھا۔ اور اس سے زندگی کا حق چھیننے والے وہ لوگ تھے جو اس کے خیال کی قوت اور اظہار کے بانکپن سے لرزاں تھے۔ لیکن وہ اس سے

زندگی کا حق چھیننے میں کامیاب ضرور ہوئے۔ لیکن اس سے تخلیق کا فن اور خیال کی عظمت نہ چھین سکے۔ ساغر کی عظمت کی دلیل یہی ہے کہ اس نے دنیا کی خواہشوں کو ٹھکرا کر خیال کی پاکیزگی اور روح کے تقدس کی تمنا کی اور جب تک زندہ رہا فقیرانہ عظمت اس کی ہم سفر رہی۔ آج اسے ہم سے جدا ہوئے ایک سال ہو گیا۔ لیکن میں جب بھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو ساغر میرے ساتھ ہوتا ہے وہ مجھے اپنے شعر سناتا ہے اور کبھی کبھی گہرے سبز سمندر کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک غائب ہو جاتا ہے اور اس کے شعر میرے احساس کے گھروندوں میں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔



مر بھی گئے تو چادرِ صحرا اتری نہیں

فاروق عادل

ساغر کو میں ان دنوں سے جانتا ہوں جب میں سال پہلے موری دروازہ میں ایک پیلی گنبد نما عمارت میں اپنی عمر کے تجربوں کی داستانیں بیان کرنے شہر کے مختلف اطراف سے آئے ہوئے لوگ مل بیٹھتے تھے وہاں ساغر ہم سب سے اس طرح گھل مل جاتا۔ جیسے ہمارا ہم عمر ہو۔

اس کے بعد ساغر صدیقی سے ملاقاتیں اس لیے طویل نہ رہیں کہ وہ ایک ایسے زندگی کے بحر بیکراں میں اتر چکا تھا۔ جس کی گہرائی گیرائی کا احساس ہوتے ہی انسان کانپ اٹھے اس بحرِ بیکراں کی اتھاہ کا نہ ساغر کو علم تھا نہ مجھے۔

ساغر کا اور میرا رشتہ ایک انسان کا تھا جو حُسنِ اتفاق سے شاعر بھی تھا۔ غالب سے لے کر اب تک شاعر کی بے قدری جس قدر ہمارے معاشرے میں ہوئی اس کی مثال کسی دوسری قوم اور ثقافت میں نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے ہاں ایک واضح مثال اس دور میں ساغر صدیقی ہے جو ایک اچھا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر بھی تھا۔

ساغر نے زمانے کی ناقدر شناسی کا انتقام اپنے آپ سے لے کر یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے نظام کی جڑیں کھوکھلی ہیں اور اقدار سنگدلانہ ہیں۔ جس کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے۔

یا رب ترے جہاں کے کیا حال ہو گئے
کچھ لوگ خواہشات کے دلال ہو گئے
وحشت میں اپنے تار گریباں ہی دوستو
الجھے تو ہر قدم پہ گراں جال ہو گئے

ساغر کے دل میں بھی ایک صاف ستھری زندگی کی امنگ اور آرزو سر سبز بہاڑ کے دامن

میں آبشار بن کر گرنے والے جھرنے کی طرح جاری و ساری اور رواں تھی۔ یہی روانی، یہی شادابی اور آہنگ آپ کو اس کی شاعری میں جا بجا ملے گا۔

ساغر کو جب بھی کسی مشاعرے سے موٹی رقم دستیاب ہوتی تو وہ اپنے بوسیدہ کپڑے اتار کر نئے سلے ہوئے کپڑے زیب تن کرتا، نئی جوتی اور گھڑی خریدتا۔ شیروانی پہنے خوش خوش اور قہقہہ لگاتا دکھائی دیتا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ساغر کو اچھے صاف ستھرے کپڑوں سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی

مٹ گئی بربادیٔ دل کی شکایت دوستو!
اب گلستاں رکھ لیا ہے میں نے ویرانے کا نام

ساغر کا کہنا تھا کہ اگر فن بیچ کر ہی اپنے آپ کو ستھرا رکھا جا سکتا ہے تو پھر فن کو ہی کیوں نہ صاف ستھرا رکھا جائے۔

ساغر اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ کہیں بھی نہیں گیا۔ ہمیشہ کے لیے جدا نہیں ہوا۔ وہ ابھی ابھی اپنی ترنگ میں اٹھ کر گیا ہے اور وہ کہیں نہ کہیں بارہ دروازوں کے باہر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک کے کسی چوراہے پر یا کسی باغ میں درخت کے نیچے، داتا صاحبؒ کے ارد گرد کی معطر فضا میں یا بارہ دروازوں میں سے ایک دروازے کے باہر اچانک مل جائے گا اور اپنی مخصوص آواز میں کہے گا۔

"بابا لوگ ولایت سے کب آئے"

ساغر نے اپنے من کو سنوارنے اور نکھارنے میں جو صدمے اٹھائے اور جو قربانیاں دیں اس کی جھلک اس کی شاعری میں رنگ اور خوشبو، دھوپ اور شگوفے، راحتیں اور اذیتیں، بے نیازی اور نیازمندی کے رنگوں میں ہر سطر، ہر شعر، ہر غزل اور نظم میں موجود ہے۔

صبح دیکھا شگوفے تھے ٹوٹے ہوئے
گل کھلاتی رہی رات بھر چاندنی
پوچھا کسی نے حال کسی کا تو رو دیئے
پانی میں عکس چاند کا دیکھا تو رو دیئے

ساغر کے اشعار میں ایسے تجربوں کی صدا بھی ہے جو اس دور کے دوسرے شاعروں کے ہاں موجود نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ساغر جس بحر بیکراں کا غوطہ زن تھا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

کچھ کیفِ سحر ہے نہ مجھے شام کا نشہ
ہے میرے لیے بادۂ بے نام کا نشہ
ہر گام لرزتے ہوئے تدبیر کے پیکر
تقدیر کی آنکھوں میں ہے آلام کا نشہ

ساغر مجموعی طور پر جذبات اور احساسات کا شاعر تھا۔ ساغر جو کچھ بھی سوچتا تھا وہ اسے دل کے پلڑوں پہ تولتا تھا جو بات اس کے دل میں اتر جاتی وہی بات پھر دل کے خیاباں سے لے کر ذہن کے بیاباں تک گلکاریاں کرتی ہوئی اظہار میں آتی تھی۔

شمع جس کی آبرو پہ جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے، فنا ہوتا نہیں

کچھ فسانوں میں حقیقت کی جھلک ہوتی ہے
کچھ حقیقت سے بنا لیتے ہیں افسانے بھی

ساغر اگر پیدائشی شاعر نہ ہوتا تو یہ فن اس میں اپنی موت سے پہلے مر گیا ہوتا۔ بلکہ ہوا یہ کہ ساغر کو فن نے زندہ رکھا، مگر زمانے نے اسے مار دیا۔ ساغر اب ہمارے سامنے اپنے فن میں زندہ ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کا فن آنے والی نسل تک پہنچے گا۔ آنے والی نسل اس کی انفرادیت سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہے گی۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد اردو شاعری خصوصاً غزل میں جو نام ابھرے ان میں ساغر صدیقی مرحوم کا نام بھی سرفہرست رکھا جا سکتا ہے

ناصر کاظمی سے لے کر منیر نیازی تک جب ہم نئی غزل میں تجربات کی بات کرتے تو ہمیں

ساغر صدیقی احساسات اور جذبات کی دنیا میں اپنے ہی روپ میں الگ تھلگ تجربوں کی کوکھ سے جنم لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ساغر کی شاعری سے اگر ساغر کو نکال دیا جائے تو باقی کچھ بھی نہیں۔ ایک اچھے اور عظیم شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں سانس لیتا ہوا محسوس ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنیں شعر کے ایک ایک لفظ میں صاف سنائی دیں۔ ساغر اپنی ذات میں گم سم رہنے کے باوجود بھی اپنے گرد و پیش سے ایک باشعور لکھنے والے کی طرح باخبر تھا۔ وہ اپنی ذات کی گہرائیوں سے نکل کر اردگرد کے ماحول اور زندگی کی بوقلمونیوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا کوئی بھی فنکار محض اپنی ذات میں گم رہ کر ایک اچھا فن کار نہیں بن سکتا۔ بلکہ وہ تصنع کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے تجزیے کے مطابق، ایسا فن کار یا شاعر کبھی پختگی کی دہلیز نہیں پھلانگتا۔ وہ شعوری اور لاشعوری اظہار میں امتیاز نہیں کر پاتا۔ یعنی جہاں اسے خیالات کا اظہار شعوری طور پر کرنا چاہیئے وہاں لاشعوریت کا شکار ہو جاتا ہے اور جہاں لاشعوریت نازک ترین خیالات کا اظہار چاہتی ہے وہاں وہ شعور کے پتھر سے سر پھوڑتا رہ جاتا ہے۔

ساغر صدیقی کے اس مرض سے محفوظ رہنے کی وجہ اس کی اپنی غیر متعصب شخصیت تھی بغرور اس میں نام کو بھی نہ تھا وہ اپنا مقابلہ کبھی کسی دوسرے شاعر سے نہیں کرتا تھا۔ اپنی درویشانہ زندگی میں بہت مسرور رہتا۔ نہ تو اسے اپنی تعریف کی خواہش تھی اور نہ ہی صلے کی تمنا۔

ایک گواہی یہ بھی ہے کہ جب بھی اس صوفی منش شاعر کو ڈھیروں روپے کی صورت میں معاوضہ ملتا تو وہ اپنی ضرورت کی رقم اٹھا کر باقی فقیروں اور گداگروں کو بانٹ دیتا۔

ساغر کو اس کے شعروں میں ضرورتوں سے بھی بے نیاز دیکھا جا سکتا ہے۔

اس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بری نہیں

ساغر صدیقی

—— اے حمید ——

(یارانِ وطن کے زیرِ اہتمام ساغر صدیقی کی پہلی برسی پر پاکستان نیشنل سنٹر لاہور میں پڑھا گیا)

ساغر صدیقی کو میں نے پہلی مرتبہ امرتسر میں دیکھا۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ امرتسر میرا شہر تھا۔ امرتسر ساغر کا بھی شہر تھا۔ مجھے میرا ایک دوست یہ کہہ کر اس سے ملوانے لے گیا۔ آؤ تمہیں ایک شاعر سے ملاؤں جو بڑی اچھی غزل کہتا ہے۔ ہم تنگ سیڑھیوں میں سے ہو کر اوپر چوبارے میں گئے۔ ساغر صدیقی اپنے اڈے پر بیٹھا کنگھیاں بنا رہا تھا۔ دبلا پتلا۔ نسواری بھیگی ہوئی آنکھیں۔ نسواری بال جو بڑے چمک رہے تھے اور جن میں کُنڈل پڑے تھے۔ ہم نے کیا باتیں کیں؟ مجھے یاد نہیں۔ مگر مجھے ساغر کے کنڈلوں والے چمکیلے بال آج بھی یاد ہیں۔ ان بالوں کا اس نے لاہور آکر بہت بُرا حشر کیا۔ مگر کمال کی بات ہے کہ وہ لاہور کی مٹی اور گرد و غبار میں میلے چکٹ ہو گئے لیکن سفید نہیں ہوئے۔ اگر اس کے بال سفید بھی ہو جاتے تو وہ کبھی خضاب نہ لگاتا۔ لوگ سفید بالوں میں خضاب لگا کر بڑھاپے کو چھپاتے ہیں۔ لیکن بڑھاپا بھی اسلام کی طرح ہے اسے جتنا چھپاؤ۔ جتنا دباؤ اتنا ہی باہر کو ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں کالے بالوں والے بوڑھے زیادہ نظر آتے ہیں۔ امرتسر میں ساغر صدیقی سے کامریڈ ہوٹل اور فرینڈز ہوٹل میں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ وہ شعر سناتا جو مجھے اچھے لگتے۔ اس زمانے میں سارے ہی شعر اچھے لگتے تھے۔ سارے ہی درخت، سارے ہی پھول، ساری ہی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ یہ تو بعد میں آکر پتہ چلا کہ درخت اور پھول سارے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ شاعر اور لڑکی کوئی کوئی اچھی ہوتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ساغر سے گوالمنڈی کے شیراز ہوٹل میں اکثر ملاقات ہوتی۔ اب وہ مشاعروں میں شعر پڑھتا تھا اور لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ مجھے وہ اس لیے اچھا لگتا تھا

کہ باتیں بڑی دلچسپ کرتا تھا۔ پاکستان میں آ کر وہ کچھ معاشی طور پر Set نہیں ہو گیا تھا۔
ایک روز شام کو مجھے لاہور کارپوریشن کے پاس ملا اور کہنے لگا کہ میں نے خدا جانے کس پرچے کی نوکری
چھوڑی ہے اور اب اپنا ہفتہ وار اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جس پرچے کی اس نے نوکری چھوڑی تھی اس کا پبلشر اسے سال میں صرف
دو بار تنخواہ دیتا تھا۔ اس وقت ساغر نے سفید قمیض اور نسواری پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے بعد
ساغر صدیقی کے کپڑے اُترنے شروع ہو گئے۔ کوئی اس کی قمیض لے گیا۔ کوئی اس کی ٹائی لے گیا۔ کسی
نے اس کی پتلون اتار لی اور کسی نے اس کے بالوں میں سڑک کی مٹی ڈال دی۔ پہلے وہ غمزدہ اور پریشان
رہتا تھا۔ پھر اس نے کالی چادر اپنے ننگے بدن پر اوڑھی اور مسکرانے لگا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اب
اس کی مسکراہٹ میں سماج کے خلاف زہر تھا۔ نہیں میرا خیال ہے کہ ساغر اب واقعی خوش تھا کیونکہ
اب اس کا غم دوسرے کھانے لگے تھے۔

اب وہ میلے کچیلے بالوں والا سر لیے ننگے پاؤں لاہور کی سڑکوں پہ پھرتا۔ میرے خیال میں اس
کی وجہ چرس اور مارفیا نہیں تھا۔ کیونکہ اسی شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چرس پی کر بھی بڑے اعلیٰ کپڑے
پہنتے ہیں اور مارفیا لگا کر بھی بہترین ہوٹلوں میں MOVE کرتے ہیں۔

اصل میں چرس اور مارفیا کو ساغر صدیقی کا نشہ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل کپڑے اتارنے والے اس
سنگدل شہر کے لوگوں سے بھاگ کر اس نے نشے میں پناہ تلاش کی اور جب وہ اس شہر کے سنگدل
لوگوں سے بے نیاز ہو گیا تو نشہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ساغر صدیقی پر کسی بھی نشے کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس کے اعصاب آخر تک بڑے تنومند رہے۔
جتنی چرس ساغر صدیقی نے پی، جتنا مارفیا ساغر صدیقی نے لگایا اتنی چرس آج کے سب سے بڑے
شاعر کو پلا دیں۔ اتنا مارفیا آج کے سب سے بڑے شاعر کو لگا دیں اور پھر اسے کہیں کہ یہ شعر لکھ
کر دکھا دے۔

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میں تو حیران ہوں کہ اگر ساغر صدیقی چرس پینے پر مجبور نہ کیا جاتا۔ مارفیا لگانے پر مجبور نہ کیا جاتا

تو وہ کیا کچھ نہ لکھتا اور اگر آج کا بڑا شاعر اتنی چرس پیتا. اتنا ارفیا لگاتا تو وہ تو کچھ بھی نہ لکھ سکتا
میں ایک مشہور شاعر سے ساغر صدیقی کی بات کر رہا تھا. یہ مشہور شاعر میرا بڑا بے تکلف دوست
ہے. مجھے معلوم ہے کہ وہ صبح کے ناشتے پر آدھ سیر خالص دودھ پیتا کبھی نہیں بھولتا. اس کی وجہ
یہ بتاتا ہے کہ اس سے عمر لمبی ہوتی ہے. کہنے لگا ایک بار ساغر صدیقی کو میں نے لکشمی چوک میں آتے
دیکھا، مجھے پتہ تھا کہ وہ اپنے نشے پانی کے لیے مجھ سے پیسے مانگے گا. میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا.
ساغر صدیقی چلا گیا. اس نے مجھے نہیں دیکھا. میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس سے پیچھا چھوٹا. مگر مجھے
یقین ہے کہ ساغر صدیقی سے اُس مشہور شاعر کا پیچھا نہیں چھوٹا. ساغر صدیقی آج بھی اس کا تعاقب
کر رہا ہے اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے. جب ناشتے پر خالص دودھ کا گلاس پینے والے مشہور
شاعر کے دودھ کا پانی الگ ہو جائے گا اور ساغر صدیقی کے پانی کے پہاڑ میں سے دودھ کی نہر
بہہ نکلے گی.

مجھے یاد ہے امرتسر میں ساغر صدیقی دو گھوڑا بوسکی کی قمیص پہنا کرتا تھا. اس زمانے میں
ہم سب دو گھوڑا بوسکی کی قمیصیں پہنا کرتے تھے. اب تو دو گھوڑے بیچ کر بوسکی کی ایک قمیص
آتی ہے.

بوسکی کا مجھے اس لیے خیال آیا کہ یہ کپڑا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے. ساغر صدیقی بوسکی
کی قمیص میں بڑا اسمارٹ لگتا تھا. لاہور میں جب وہ ننگا ہو گیا اور ایک کالی چادر اور میلے کچیلے
بالوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے لگا تو وہ جب کبھی مجھے ملتا تو میرے دل میں ایک ہی خیال آتا
کہ میں اس کے سر کے سارے بال استرے سے صاف کر دوں.

اس کی میلی کچیلی درویشی مجھے بالکل پسند نہیں تھی. حالانکہ میں نے ایسے درویش بھی دیکھے
ہیں جن کے بے داغ سفید کپڑوں سے عطر کی خوشبو آتی ہے اور جو تیلون کے ساتھ ٹی شرٹ پہنتے ہیں
اور ٹائی بھی لگاتے ہیں. مگر ان کے دلوں میں ساغر صدیقی کے بالوں سے زیادہ میل بھری ہوتی ہے
اصل میں، میں چاہتا تھا کہ جتنا صاف ستھرا. بے لوث دل ساغر صدیقی کا ہے. اتنا صاف
ستھرا بے لوث اس کا لباس بھی ہونا چاہیئے. جتنی خوشبو اس کے دل سے آتی ہے. اتنی خوشبو
اس کے کپڑوں سے بھی آنی چاہیے. جتنے مضبوط اس کے اعصاب ہیں. جتنا مضبوط اس

کا باطن ہے اتنا مضبوط اس کا ظاہر بھی ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو سونا بنالیا اور اپنا سارا پیتل باہر الٹ دیا تھا۔ اس نے سورج ہضم کر لیا تھا اور تاریک راتوں کا اندھیرا باہر پھینک دیا تھا۔ مجھے اس کی ایک بات بڑی پسند تھی کہ وہ سگریٹ بڑے اچھے پیتا تھا۔ شروع شروع میں وہ گھٹیا سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مگر بعد میں اس نے گولڈن ڈبی والے گولڈ فلیک پینے شروع کر دیئے جو بڑے خاندانی سگریٹ ہوا کرتے تھے۔ آخری دنوں میں وہ کیپسٹن پیا کرتا تھا۔ حالانکہ چرس پینے والوں کے لیے اعلیٰ سگریٹ بڑا غیر مفید ہوتا ہے۔ لیکن ساغر نے کیپسٹن سگریٹ سے نیچے اترنا گوارا نہ کیا۔

لیکن اب وہ بہت ہی فقیر ہو گیا تھا۔ فقیران معنوں میں کہ بہت ہی میلا کچیلا ہو گیا تھا۔ مجھ سے کبھی کبھی کسی سڑک پر ملاقات ہو جاتی۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ کبھی کبھی امرتسر کے کمپنی باغ اور کالے باغوں کے امرود کے درختوں کی بات ہوتی۔ یہ بات میں کرتا۔ ساغر صدیقی ذرا سا مسکراتا، امرتسر کو یاد کرتا اور اپنے شعر سنانے لگتا۔ میں اس کے شعر بالکل نہ سنتا اور کالے باغوں کے امرود کے درختوں میں جا کر بیٹھ جاتا۔

پھر ایک روز میں لوہاری دروازے کے باہر ایک مشہور ادبی پبلشر کی دکان میں بیٹھا تھا کہ میں نے ایک گندے مندے کمبل کو دیکھا جو ایک خانے میں ٹھنسا ہوا تھا۔

میں نے پبلشر سے پوچھا کہ یہ گندہ کمبل کس کا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ساغر صدیقی کا ہے۔ معلوم ہوا کہ ساغر صدیقی اس پبلشر کے پاس دن میں ایک بار آتا ہے اور اپنی غزلیں پانچ روپے فی غزل کے حساب سے لکھ کر دے جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ساغر آگیا۔ مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ جس طرح کہ وہ ہر دوست کو دیکھ کر ہوا کرتا تھا۔ فوراً دو چار غزلیں لکھ کر پبلشر کو دیں اور پیسے لے کر مارفیا کا انجکشن لگوانے چلا گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ پبلشر بڑا ایماندار تھا کہ ساغر صدیقی کو اس کی ایک غزل کے پانچ روپے ادا کر دیتا تھا۔ میں تو میں ایسے پبلشر کو بھی جانتا ہوں کہ جس نے ساغر کو ایک پائی ادا نہیں کی اور اس کے دیوان چھاپے ہیں اور بار بار چھاپ رہا ہے۔ دیوان بار بار اس لیے چھپ رہا ہے کہ ساغر صدیقی مرنے کے بعد زندہ ہو گیا ہے۔ اور مرنے کے بعد تو کوئی کوئی زندہ ہوتا ہے۔

ساغر صدیقی کی موت کی خبر مجھے اس کے لاہور کے ایک دوست نے دی۔ اس کے لیے وہ آج مرا تھا۔ میں ساغر صدیقی کے جنازے میں نہیں گیا جس طرح کہ میں اپنے دوستوں کے جنازے میں نہیں جایا کرتا۔ اور جس طرح میں چاہتا ہوں کہ میرے جنازے میں میرا کوئی دوست شریک نہ ہو۔ اب میں اس پر مضمون لکھنے بیٹھا تو وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ گولڈ فلیک کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ مجھے دیا۔ ایک سگریٹ خود سلگایا اور چپکے سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ لوگ تو چپکے سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جب موت آئی ہو گی تو ساغر صدیقی کو اتنا زیادہ تیار دیکھ کر خود بھی حیران ہو گئی ہو گی۔ اگر کچھ دیر لگائی ہو گی تو موت نے لگائی ہو گی۔ ساغر نے کوئی دیر نہیں لگائی ہو گی۔

ساغر صدیقی نے مرنے میں بہت جلدی دکھائی۔ میں جب کبھی اسے شہر لاہور کی بارونق سڑکوں پر فقیروں کی طرح گھومتا پھرتا دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک سادھو جنگل سے بن باس لے کر شہر میں آگیا ہے۔ ساغر صدیقی کے لیے یہ شہر ایک جنگل ہی تھا۔ جہاں تپتی سڑکوں کے پہاڑ تھے اور اس کی غزلوں کی ہرنیوں کو شکار کرنے والے ظالم شکاری تھے آج اس کی تمام غزلوں کی ہرنیاں شکار ہو چکی ہیں۔ یہ جو آپ اس کے چھپے ہوئے دیوان دیکھ رہے ہیں یہ وہ طشت ہیں جن میں ساغر صدیقی کی غزلوں کی لاشیں سجا کر رکھی گئی ہیں۔ جو شخص بیس برس تک لاہور کی سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرتا رہا ہو۔ اس پر مضمون لکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جوتا اتار کر بیٹھوں۔ ساغر صدیقی بیس برس اس شہر میں ننگے پاؤں پھرا۔ معلوم نہیں کہ اس نے اس شہر کی سڑکوں کا احترام کیا اور اس پر جوتا نہ رکھا یا اپنے جوتے کا احترام کیا کہ اس شہر کی سڑکوں سے بچایا۔

ساغر صدیقی

آوارۂ جنوں

______ تجمل حسین

اس کو بے مہرئ عالم کا صلہ کہتے ہیں!
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا!

میرے علم و مشاہدہ کے مطابق یہ شعر بہت سے مرنے والوں کے تذکرے میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کا جس قدر صحیح اطلاق ساغر صدیقی پر ہوتا ہے، شاید کسی اور پر نہ ہو میں ساغر صدیقی کو اس دور سے جانتا ہوں جب میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا اور اس شہر کی علمی و ادبی فضا مختلف اور ممتاز سخنوروں کے کلام سے گونج رہی تھی۔ اس دور میں ساغر ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دار اور ذی شعور انسان بھی تھا۔ میں نے اسے کئی مرتبہ نجی محفلوں میں بھی سنا اور کئی مشاعروں کی غلغلہ انگیز فضا میں بھی۔ ہر چند کہ وہ اس کی شاعری کا عہدِ آغاز تھا۔ مگر اس کے فکر و خیال کا بانکپن اس کے ایک ایک شعر سے نمایاں تھا۔ پھر اس کی آواز کا سوز و سرور اس پر مستزاد تھا۔ وہ جس محفل میں پڑھتا حسنِ افکار اور حسنِ آواز کی بنیاد پر محفل پہ ایک سحر طاری کر دیتا۔ اس کی شاعری کے عروج کا زمانہ آیا تو برصغیر تقسیم ہو گیا۔ لٹے ہوئے قافلوں کے ساتھ ساغر نے بھی اس سرزمین پہ قدم رکھا، مگر یہاں کی اقتصادی اور سماجی آب و ہوا اس کو راس نہ آئی اس کی زندگی سے ترتیب و تنظیم کے خطوط رفتہ رفتہ مدھم ہونے لگے، دن رات ناہموار حالات کا مقابلہ کرتا اور درد میں ڈوبے ہوئے شعر کہتا۔ بس اُس کے یہی دو مشاغل تھے، خود ساغر مرحوم نے میرے اس خیال کی تائیدیوں کی ہے کہ۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

حالات کی ستم ظریفیاں رفتہ رفتہ ساغر کو اس مقام پر لے آئیں کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں زندگی کی ہر احتیاط کا سانچہ توڑ دیا، اور ایک آوارہ جنوں درویش کی صفات کو اس طرح اپنا لیا کہ اسے گردشِ شام و سحر کی خبر بھی نہ رہی۔ اس فقر و فاقہ اس درویشی اور اس بے نیازی کو ساغر نے اس مے کی طرح اپنا لیا، جس کے بارے میں غالب نے کہا تھا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو
اک گُونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

اس نے رنج والم کی کڑی دھوپ سے بچنے کے لیے اسی گونہ بے خودی کی چھاؤں کا سہارا لیا اور زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے اچانک ایک دن راہیٔ ملکِ بقا ہوگیا۔ مگر میری طرح شاید اور بھی لوگ جانتے ہوں کہ موت سے چند روز قبل اس نے ہر آشنا و ناآشنا سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں چراغِ آخرِ شب ہوں نہ جانے ہوا کا کون سا جھونکا مجھے بجھا کر رکھ دے۔ اس کی یہ بات سُن کر جان پڑتا جیسے اس کو اپنی موت کا پتہ چل چکا ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ساغر کوئی ولی یا صاحبِ کشف و کرامات تھا۔ مگر چونکہ وہ ایک فنکار تھا اور شدت احساس کی دولت اس کے پاس تھی۔ اس لیے آنے والے حالات کی تصویر بھی اس کے دل و دماغ کے پردوں پر جھلملانے لگتی تھی۔

ساغر نے اپنے تجربات و مشاہدات کو غزل کی روائتی خوبیوں کے سانچے میں بڑی ندرت آفرینی اور جدت طرازی کے ساتھ سمونے کی کامیاب کوشش کی۔ زندگی کے قریب تر رہ کر اس نے جہاں جہاں بھی اظہار خیال کیا ہے اس کا ایک ایک شعر برق پارے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس سچائی کی تمام تر جھلکیاں اس کے مندرجہ ذیل اشعار میں بڑی نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

جسے اپنا یار کہنا اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیثِ دلبراں ہے، یہ کمالِ دلبری ہے

وہ گزر گیا ہے ساغرؔ کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ ہو گئی ہے

کوئی نیا رنگ بخش اس کو کوئی نئی روح پھونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی
یہ جگنوؤں کی چمک پہ بھی اب سنبھال لیتے ہیں اپنا خرمن
مجھے یقیں ہے کہ ڈر گئے ہیں شبِ چراغاں سے لوگ ساقی
خیال ہے میکدے میں اک بار، اور شعلوں کا راج ہوگا
شنید ہے انتقام لیں گے نشاطِ دوراں سے لوگ ساقی

ساغر کے فن کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ الجھی ہوئی فلسفیانہ بات کو بھی سلجھے ہوئے قلندرانہ اسلوب میں بیان کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ اس نے اپنے غم کو بہت سے غمزدہ لوگوں کے غم کی علامت سمجھ رکھا تھا اور اپنے علاوہ دوسروں پر بیتے ہوئے حادثات کو بھی نظم کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ مطالعے کی تنہائیوں میں اس کا کلام ان حقائق کی بڑی واضح شہادتیں پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پہ

پلٹ کر زندگی کو زخمِ تازہ دے گئی اکثر
ہمارے نالہ و شیون کی ہر تاثیر ظالم ہے

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

ساہگذاروں پہ لٹ گئی رادہا
شام نے بانسری کو بیچ دیا
لب ورخسار کے عوض میں نے
سطوتِ خسروی کو بیچ دیا
عشق بہروپیا ہے اے ساغر
روپ نے سادگی کو بیچ دیا

ہراک ذہن میں ہے خدائی کا دعوی
ہراک آستیں میں صنم سو رہے ہیں
مری اجڑی اجڑی سی آنکھوں میں ساغر
زمانے کے رنج والم سو رہے ہیں

ساغر صدیقی کے کلام میں غالب کا فلسفہ، داغ کی شوخی اور میر کی سادگی نہ سہی، مگر اس کے باوجود وہ ایک انفرادی طرزِ اظہار رکھتا ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ اسی ایک چیز نے اس کو اہلِ سخن میں ممتاز بنا دیا ہے. بنیادی خیال کی صداقت، عظمت، بلندی اور سادگی و پرکاری کے ساتھ اپنے بیان کے لیے قدم قدم پر وہ ریشمیں الفاظ اور سجیلے لہجے کا سہارا لیتا ہے. بولتی ہوئی ردیفوں اور چمکتے ہوئے قافیوں کے ساتھ وہ اپنی غزل کو اس طرح آراستہ کرتا ہے کہ اس کا ہر شعر ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ معانی و مفہوم کی گہرائی اور گیرائی کا بھی ایک دل آویز نمونہ بن جاتا ہے. اس ضمن میں مرحوم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

کل جنہیں چھو بھی نہ سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

کچھ لوگ تمناؤں کا خوں چہرے پہ مل کر
بیٹھے ہیں سرِ راہگذر شہر میں تیرے
اٹھتے رہے کلیوں کی جوانی کے جنازے
جلتے رہے پھولوں کے نگر شہر میں تیرے

جسے نہ زہرِ جنوں کی ذرا سی چاٹ لگے
وہ بے شعور محبت مزور مرتی ہے
طلوعِ مہر ترے آستاں پہ ہوتا ہے
کرن کرن تری دہلیز پہ اُترتی ہے

ساغر مرحوم کی شاعری کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اشعار میں معانی کی گونج اور الفاظ کی کھنک قاری کے ذہن میں ایک ایسی فضا تیار کرتی ہے، جو اس کے دل و دماغ کو ایک شدید قسم کے تاثر کی گرفت میں لے لیتی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے کمالِ فن کا اعتراف نہ کرنا بد مذاقی ہی نہیں بلکہ ایک فن کار کے ساتھ بہت بڑی زیادتی بھی ہے۔

میرے نزدیک شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تلوار کی طرح کاٹے اور تیر کی طرح پیوست ہو جائے اور ساغر کے بیشتر اشعار میں یہ سحر نگاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس کے بعض اشعار ایسے ہیں جیسے کسی نے آگ اور شہد کو ہم آمیز کر کے رکھ دیا ہو۔ اس کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں، جنہیں پڑھ کر ان پہ انگاروں سے کھیلتی ہوئی شبنم کا گمان گذرا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو ان اشعار میں اس حقیقت کی نمایاں جھلک نظر آئے گی۔

نالہ حدودِ کوئے رسا سے گزر گیا
اب دردِ دل علاج و دوا سے گزر گیا

انصاف سیم و زر کی تجلی نے ڈس لیا
ہر جرم احتیاج سزا سے گزر گیا

یہ اور بات کہ تم آئے ہو تو کوئی نہیں
وگرنہ غم تو یہاں بے شمار رہتے ہیں

جہانِ قدس بھی میری نظر سے گزرا ہے
وہاں بھی تیری نظر کے شکار رہتے ہیں

ہر ایک گام پہ ہیں پتھروں کی دیواریں
سکوتِ اہلِ ہنر سے خطاب کرتا ہوں

بنامِ عظمتِ یزداں کبھی کبھی ساغر
وقارِ حُسنِ بشر سے خطاب کرتا ہوں

یہ واردات بھی اب دل پہ روز ہوتی ہے
مسرتوں میں بھی ہم کو ملال ہوتا ہے!!

جواب دے نہ سکیں جس کا دو جہاں ساغر
کسی غریب کے دل کا سوال ہوتا ہے

سفرِ آخرت

مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس ہے





مشہور شاعر

ساغر صدیقی انتقال کر گئے

لاہور۔ ۲۰ جولائی، پاکستان کے ایک معروف مگر دنیاوی آسائشوں اور سماجی مرتبے سے محروم شاعر ساغر صدیقی آج پچاس سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ساغر صدیقی نے جن کی آواز کا جادو کبھی بڑے مشاعروں میں گونجتا تھا، طویل عرصے سے قلندری اور درویشی اختیار کر لی تھی۔ ان کا واحد دنیاوی ترکہ ان کے کلام کا مجموعہ "خشتِ میکدہ" ہے۔ اس کے سوا مرحوم شاعر نے دنیا میں اپنی کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ساغر صدیقی کی میت کو آج سہ پہر میانی صاحب

کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ساغر صدیقی کی موت بھی اردو کے رومانوی غزل گو شاعروں کی طرح انتہائی کسمپرسی میں واقع ہوئی۔ وہ شخص جس نے اپنی شاعری اور ترنم کے عروج کے دور میں لاتعداد مشاعرے لوٹے، ہزاروں افراد سے داد وصول کی آج ان حالات میں مرا جب کہ اس کی موت پر کوئی آنکھ پرنم نہیں تھی۔ وہ گمنامی میں چپ چاپ چل بسا۔ لاہور کے ادبی حلقوں تک کو ساغر صدیقی کی موت کی خبر نہیں ملی۔ ان حلقوں کو یہ اطلاع مرحوم کی تدفین کے کئی گھنٹے بعد ملی۔

ساغر صدیقی نیم دیوانگی کے عالم میں بھی شاعری کرتے رہے ان کی نظمیں اور غزلیں حال تک بعض مقامی روزناموں میں چھپتی رہیں۔ ساغر کے آہنگ میں یاسیت کا تاثر بہت گہرا تھا۔ آخری ایام میں وہ حمد اور نعت کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ساغر کی زندگی کا المیہ اردو کے بیشتر غزل گو شعرا سے مختلف نہیں تھا۔ پچھلے کئی برس سے داتا دربار کے قریب چنڈو خانے ان کا مسکن تھے۔ ایک سیاہ چادر ان کا لباس تھا۔ وہ خود کو درویش کہتے تھے اور روح و زندگی کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے دوستوں اور مداحوں سے صرف چند آنے لے کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ لاہور یا پاکستان کی کسی ادبی انجمن نے ساغر صدیقی کی مالی امداد نہیں کی اور غالباً حکومت پاکستان کے متعلقہ ادارے بھی ساغر کی خستہ حالی سے بے خبر رہے۔

امروز — لاہور

اُردو کے نامور صوفی منش شاعر ساغر صدیقی انتقال کر گئے

لاہور ۲۰ جولائی (اپنے سٹاف رپورٹر سے) اردو کے نامور صوفی منش شاعر جناب ساغر صدیقی نہایت کسمپرسی کی حالت میں آج انتقال کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ انہیں آج میانی صاحب کے قبرستان میں چند سوگوار شاعر دوستوں اور مداحوں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک مجموعۂ کلام خشتِ میکدہ اور چند پھٹے پرانے چیتھڑے چھوڑے ہیں۔ مرحوم شاعر نوائے وقت کے خصوصی قلمی معاون تھے اور پاکستان آنے کے بعد نوائے وقت کے لیے باقاعدگی سے اپنا کلام لکھتے رہے ان کی ایک نعت شریف اسی ماہ شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے

حاصل جسے ہو جائے عرفان محمدؐ کا
سایہ اسے دیتا ہے دامان محمدؐ کا

وہ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے ان کے شناساؤں کا کہنا ہے کہ شروع عمر میں وہ خوش پوش نوجوان تھے، لیکن ہجرت کے بعد ان کی حالت یکسر بدل گئی۔ انہوں نے خوش نما ملبوسات ترک کر کے پھٹے پرانے اور نہایت میلے کچیلے کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے جوگ لے لیا ہے۔ ان کی حالت بالکل ملنگوں جیسی تھی وہ اتنے خوب صورت شعر کہتے تھے کہ ان کی شکل و صورت دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شعر ایسے ملنگ نے کہے ہیں۔ تصوف کے اثرات ان کے مزاج اور شاعری پر غالب رہے وہ اکثر حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار کے آس پاس دیکھے جاتے تھے۔ ان کی شاعری کے سوز و گداز اور بانکپن نے مداحوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ غزل کے علاوہ نعت بھی کہتے تھے اور حبِ رسولؐ سے سرشار تھے۔ انہوں نے فلموں کے لیے بے شمار شعر کہے اور بعض فلمیں تو ان کے شعروں کے مرکزی خیال پر بنائی گئیں لیکن انہیں اس کلام کا حقیر معاوضہ ملتا رہا اور اکثر اوقات کچھ بھی نہیں علاوہ جاننے والوں سے کچھ

قرض لے کر اپنا گذارہ کرتے رہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

ساغرؔ کی زندگی پر کچھ تبصرہ نہ کیجیے
اک شمع جل رہی ہے سرِ رہ گذارِ زیست

نوائے وقت لاہور

ساغر صدیقی کا المیہ

ساغر صدیقی دنیا سے اس طرح دبے پاؤں گزر گیا کہ بہت سے لوگوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ادب کی دنیا میں کتنا بڑا سانحہ پیش آیا۔ وہ ہمارے معاشرے کی چیرہ دستیوں اور سرد مہریوں کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ اس معاشرے میں جہاں اونچی دکانوں اور پھیکے پکوانوں کی کوئی کمی نہیں ہے، جہاں نااہلوں کو اعزاز و اکرام سے نوازنا اور باصلاحیت افراد کی ناقدری کرنا ایک معمول بن چکا ہے، جہاں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کو صناعی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ساغر کا کون پرسانِ حال ہو سکتا تھا۔ ساغر نے معاشرے کو اپنا خونِ جگر دیا لیکن اس کے بدلے اسے محرومی اور تنگدستی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ساغر صدیقی کی زندگی اس دنیا اور اس کے طور طریقوں کے خلاف ایک احتجاج تھی۔ ایک خاموش لیکن دلدوز احتجاج۔ دنیا نے جب اس سے بے اعتنائی کی تو اس نے بھی اس دنیا کو ٹھکرا دیا اور خود اپنی ذات کے اندر سمٹ کر رہ گیا۔ اس کی غیرت نے کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانا گوارا نہیں کیا۔ اس کے سینے میں ایک ننھی سی شمع فروزاں تھی جس کے لمعات کبھی کبھی حسین شعروں کی شکل میں باہر بھی نکل آتے تھے لیکن احساس کی اس شمع نے اس کی ذات کو جلا کر اندر ہی اندر خاکستر کر دیا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں، محرومیوں، ناکامیوں اور اہلِ دنیا کی بے اعتنائیوں سے فرار ڈھونڈنے کے لیے اس نے "یک گونہ بے خودی" کی تلاش شروع کی اور اسی جستجو نے اسے عدم آباد پہنچا دیا لیکن اس حال میں کہ نہ کسی کو اس کی بیماری کی اطلاع ہوئی نہ کسی نے اس کے علاج کی فکر کی اور نہ اس کے مرنے کا اس طرح سوگ منایا گیا جس کا وہ ایک شاعر کی حیثیت سے مستحق تھا۔

روزنامہ مشرق لاہور

آدھی انچی کی خبر

ساغر صدیقی کا انتقال ہوگیا

لاہور ۲۰ جولائی (اپ پ ا) اردو کے ممتاز شاعر مسٹر
ساغر صدیقی کا آج یہاں انتقال ہوگیا۔ بعدازاں انہیں دوپہر
کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

لاہور کے ایک اخبار میں ایک آدھی انچی کی خبر دیکھی۔ کسی کے مرنے کی ہے لیکن نہ کالا حاشیہ نہ سوئم کی اطلاع ــــ نہ سوگواروں کی لمبی فہرست نہ تعزیتی پیغامات کی یورش۔ نہ تاریخ نہ قطعہ تاریخ، بس سیدھے سادے چار پانچ لفظ۔

"آج ساغر صدیقی کا انتقال ہوگیا"۔

نیچے پوری خبر یوں ہے۔

لاہور۔ اردو کے ممتاز شاعر مسٹر ساغر صدیقی کا آج یہاں انتقال ہوگیا۔ بعدازاں انہیں دوپہر کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ساغر صدیقی سے ہماری ملاقات نہ تھی، لیکن یہ معلوم ہے قلندر تھا ایک بار اخبار میں کالے بھجنگ ہڈیوں کے ڈھانچے کی تصویر بھی چھپی تھی جس کے نیچے ساغر صدیقی کا نام لکھا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کالم نگار ایک دو فقرے اس کی حالتِ زار کے نقشے میں لکھ جاتا تھا۔ ایک آدھ بار اس مرحوم کی کوئی غزل بھی مرحوم ہی کی طرح حسرت کا مرقع ہماری نظر سے گذری۔ پھر کسی کی اپیل بھی دیکھی کہ ساغر صدیقی بیمار ہے۔ مر رہا ہے۔ اے لوگو مدد کو پہنچو۔ رائٹرز گلڈ اور کچھ اور فرض شناسوں نے دامے درمے قدمے سخنے شاید کچھ کیا بھی ہوگا۔ لیکن یہ امدادیں مرتے کے منہ میں پانی ہوتی ہیں کہ مرے بے شک، اس سے نہیں روکتے لیکن پیاسا تو نہ مرے۔ ہم پاس نہ تھے لیکن جس کی زندگی ایسی تھی۔ اس

کی موت بھی چنداں خوبصورت نہیں ہو سکتی۔ حفیظ جالندھری

جمع ہیں احباب بالیں پر مرے
موت کتنی خوبصورت ہو گئی

ساغر صدیقی کی یاد میں اخباروں کے خاص نمبر تو چھپنے سے رہے اور سوگ میں جھنڈے تو سرنگوں ہونے سے رہے اور اس کے نام پر کسی سڑک یا چوک کا نام تو رکھا جانے سے رہا اور اس کی سال بسال برسی منائے جانے کا تو کیا امکان ہے۔ یوں چاہیے کہ اس کی عمر بھر کی کمائی یہ ڈھائی سطر کی خبر ہے۔ یا پھر سنا ہے غزلوں کا ایک غیر مطبوعہ دیوان ہے۔ دیوان تو کیا ہو گا۔ چند غزلیں پوری ادھوری میلے کاغذ پر لکھی کسی پوٹلی میں پڑی ہوں گی۔ گویا اس مرحوم نے یہ ورثہ چھوڑا۔ بہت سے شاعر ادیب تو ورثے میں ایک بیوہ اور چند یتیم بچے بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ ساغر اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔
چھوڑتا بھی تو کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک اپیل اہلِ دل اور اہلِ درد کی طرف سے اور شائع ہو تی کہ اس کے بچوں کا کچھ انتظام کیا جائے۔ گلڈ سے اور حکومت سے وظیفہ باندھنے کی درخواست کی جاتی اس کے بعد تو اپنے گھر میں اپنے گھر۔ کوئی بہت لکھتا تو چند لفظ معاشرے کی شان میں بھی لکھ دیتا کہ ادیبوں سے بے مہری برتتا ہے لیکن دیکھا جائے تو معاشرے کا کیا قصور ہے۔ کیا ادیب معاشرے سے پوچھ کر پیدا ہوتا ہے؟

اب اس آدھ انچی کی خبر کو دیکھیے جس میں ممتاز شاعر کا لفظ تو رپورٹر نے ترس کھا کر اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ زندگی میں تو کسی نے اسے ایسا بھی نہ لکھا تھا۔ یہ دو لفظ بھی مرحوم کا "آدم جی انعام" ہیں "آج یہاں انتقال ہو گیا" میں "آج" کا لفظ بھی جائے تامل ہے۔ آج کی کیا قید ہے۔ اس کا تو پیدا ہوتے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ "انتقال ہو گیا" کہنا بھی بے صرفہ ہے۔ اس شخص کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے انتقال کے۔ کیا اس کا کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ شادی، ولیمہ، استقبال، تاج پوشی، دعوت، ضیافت، عہدہ، عہدے میں ترقی؟ سپردِ خاک کرنے کی بھی ایک کہی۔ وہ تو مدت سے سپردِ خاک تھا۔ خاک کے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ خاک پھانکتا تھا۔ خاک میں مل چکا تھا۔ خاک ہو چکا تھا۔ لوگ اس پر خاک ڈال

چکے تھے۔ وہ بھی خاک سے علیحدہ ہی تھا جو اب اسے سپردِ خاک کیا گیا۔ ہاں اتنا نکتہ خبر میں شاید نیا ہو
کہ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس سے پہلے قبرستان میں سپردِ خاک نہ تھا اس سے باہر تھا۔

اس خبر میں ایک لفظ بعدازاں بھی ہے ۔۔۔ گویا لکھنے والے نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے
کہ وہ مرا پہلے، اسے دفن بعد میں کیا گیا۔ بعدازاں لکھنا ضروری تھا تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جیتے جی زمین میں
گاڑ دیا۔ دوپہر کا لفظ یہ واضح کرنے کے لیے ہے کہ صبح مرا ہوگا۔ دوپہر تک لوگ اس کی تدفین سے فارغ
بھی ہو گئے۔ یہ نہیں ہوا کہ اسے برف کی سلوں میں رکھا گیا ہو، کسی عزیز کا انتظار ہو، کسی بیٹے کو ولایت
سے آنا ہو۔ کسی بھائی کو کراچی سے آکے اس کا منہ دیکھنا ہو۔ اس کی میّت کو کسی متبرک مقام پر لے جانا ہو،
کچھ بھی نہیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ساغر صدیقی کہاں کا تھا۔ اے شخص اپنے نام کے ساتھ کچھ
دہلوی، امروہوی، فیروزپوری، سیالکوٹی وغیرہ ہی لکھا ہوتا۔ ساغر تو اپنے شوق سے بنا۔ ماں باپ نے کچھ
اور نہیں دیا۔ مکان، جائیداد وغیرہ تو کوئی نام تو دیا ہوگا۔ محمد شریف، نورالدین، عظمت اللہ نہ نام
کا نشان، نہ وطن کا نشان، نہ اولاد، نہ کتاب، تیرے لیے کوئی کرے تو کیا کرے اور لکھے تو کیا لکھے۔

ابن انشاء

روزنامہ امروز ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء

راہواں دا اِک رُلیا راہی

ویلے دی اکھ وچوں!
ہور اِک ہنجو چویا۔ ایہہ کی ہویا؟
کہندے نے اج ساغر مویا
ایس سمے دی کُکھ دے وچوں!
کیہہ ہنیری جھُلّی؟
باغ، طویلے، فٹ پاتھ ہو گئے گُنجے!
اوہ اک قطرہ، اک سمندر
اک جہاں سی جدے اندر
اوہدی لاوارث میّت تے کوئی نہ رودن والا رویا
پر بدّل ساون دا رویا۔ ایہہ کیہہ ہویا۔ ساغر مویا
راہواں دا اِک رُلیا راہی
اوہ فقیر نمانا شاعر
جس دے پاٹے لیڑے تک کے
کئی اکھاں والے انّھے
سمجھدے رہے اوہنوں بھک منگا
تے تلی ٹڈیا اک گداگر
پر اوہ سی ڈوہنگیاں سوچاں دا سچّا سوداگر
ڈوہنگھا ساگر۔ نام سی ساغر

عالم نوشاہی ـــــــــ

ساغر صدیقی نے
اپنے غم بھلا کر زمانے کے دکھوں کو
سینے سے لگا لیا تھا۔
زندہ لوگوں کو درویش شاعر کی یاد کو
تازہ رکھنا چاہیے ——— صوفی تبسم

لاہور۔ ۳ جولائی (سٹاف رپورٹر) درویش منش شاعر ساغر صدیقی کی یاد میں پاکستان نیشنل سینٹر میں شاعروں، ادیبوں، فنکاروں اور صحافیوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں مرحوم کی زندگی اور ان کے کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ شاعروں اور فنکاروں نے مرحوم کا کلام سنا کر ثابت کیا کہ ساغر صدیقی اپنی طبعی موت سے بہت پہلے مر چکا تھا۔ مقررین نے کہا کہ ساغر نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج اور معاشرے کو بہتر بنانے کی راہ دکھائی ہے وہ سماج کے دکھوں میں برابر کا شریک تھا۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے اپنی صدارتی تقریر میں مرحوم کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ساغر سہمی سہمی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو دکھ نہ دیا۔ اس کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے دکھ بھلا کر زمانے کے دکھوں کو سینے سے لگا لیا تھا۔ اسے زندگی بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ صوفی صاحب نے کہا کہ ہم زندہ لوگوں کو اس درویش شاعر کی یاد تازہ رکھنی چاہیے۔

جناب ظہیر کاشمیری نے کہا کہ مرحوم کی زندگی بظاہر بے ربط دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ہماری سوسائٹی کا ایک ناگزیر حصہ تھا۔ اس کے شعروں میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں کہ وہ صرف اپنی انا میں غرق نہیں تھا بلکہ سماج کے دکھوں میں برابر کا شریک تھا۔ انہوں نے بتایا کہ امرتسر سے لاہور آنے کے بعد ساغر کی زندگی میں تبدیلی آگئی تھی۔ اس تغیر پر تنقید نگاروں نے مختلف آراء کا اظہار کیا انہوں نے کہا کہ اگر کسی کو اس کی خواہش کے مطابق سوسائٹی نہ ملے تو وہ منشیات کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ساغر کی شاعری نغمگی اور موسیقی ہے اور اس میں زندگی نظر آتی ہے۔

جناب یونس ادیب نے کہا کہ نقادانِ ادب کو اس کی تخلیقات پر لکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ اسی لیے انہوں نے مرحوم کی زندگی سے متعلق غلط آرا ء قائم کی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم شاعر کی سوچوں اور فکر کو روکا گیا اس کے خیالوں کو اسیر کیا گیا، اس کی بیماری پر کسی نے توجہ نہ دی وہ زندگی بھر ایک کرب میں مبتلا رہا۔ لوگوں کے کہنے کے برعکس اسے اجتماع سے دکھ ملتے تھے۔ اس لیے وہ اجتماع سے گریزاں رہا اس کے اندر ایک باکمال انسان تھا: مرحوم لمحہ بھر بھی خدا کے تصور کے بغیر نہیں رہا۔ نشست کا آغاز مسٹر علی عابد نقوی نے تلاوتِ قرآن مجید سے کیا۔ بعدازاں ناؔدم عصری، طاؔلب چشتی اور قاری محمد یونس نے کلام سنایا اور اس کے بعد خالد ایاز، حسین بخش، پرویز مہدی اور غلام علی نے مرحوم کا کلام ساز و آواز کے ساتھ سنایا۔

روزنامہ مساوات لاہور ____________

محفل محفل

مجلسِ شمعِ ادب نے ساغر صدیقی کے لیے قرآن خوانی کروائی۔ ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ پڑھی اور بعد میں باقاعدہ پلاؤ زردہ اور پھل کی نیاز بانٹی۔ ایک شخص نے آہ کھینچی اور کہا کاش ہم یہ سب یا اس کا عشرِ عشیر ہی اس کی زندگی میں کر دیتے۔ اس گئے گذرے زمانے میں ایسے اہلِ دل بھی بہت غنیمت ہیں کہ ایک ایسے شاعر کی مرگ پر اتنا اہتمام کر دیا کہ جس کا کوئی عزیز، کوئی رشتہ دار فیض پہنچانے کے لیے باقی نہیں ہے۔ واصف علی واصف، صابر گیلانی اور تبسم رضوانی جیسے لوگ جن کا ساغر سے صرف ادب کا رشتہ تھا انہوں نے اس دکھ کو یوں اپنایا تھا جیسے کوئی بہت قریبی عزیز رخصت ہو گیا ہو۔ سوگ کی تقریب میں شام گہری ہو گئی تو اس محفل کو ادبی رنگ دیا گیا اور ساغر مرحوم کی ایک نعت سے محفل کا آغاز ہوا۔ صابر گیلانی نے ذاتی تعلقات کی بنا پر ساغر کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا۔ تبسم رضوانی رشید کامل اور طارق زیدی نے شاعر اور شخصیت پر مضامین پڑھے۔ کوثر صدیقی، یونس حسرت، اقبال راہی، ظہیر احمد، سعید کوکب اور رشید انبالوی نے نظم میں خراج پیش کیا۔

امروز ۲۰ ۔ ۷ ۔ ۷۴

ساغر صدیقی کے ایک عقیدت مند نے اس کی قبر کو پختہ کروا کر سنگِ مرمر کا کتبہ لگوانے کا اعلان کیا ہے۔ ایک اہلِ دل نے یہ سنا تو ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "کاش ایسی موت ہم سب کو نصیب ہو۔ زندگی ہماری بھی ساغر سے مختلف نہیں۔ ہم بھی اسے ایک عذاب کی طرح چمٹائے ہوئے ہیں۔ چلو موت کے بعد ہی سہی کسی نے اپنائیت اور عقیدت کا اظہار کر دیا، غنیمت ہے"۔ ایسی زندگی کے بارے میں فراق کا ایک شعر ہے۔

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

اپنی بے بضاعتی اور بے ثباتی کے متعلق ایک اور شاعر نے کہا ہے ؎

جیوندیاں جی تے ناں دی تختی کسے دے بوہے لگی ناں
کتبہ اپنی قبر تے آپے دھر جایئے تے چنگا اے

ساغر نے بھی زندگی میں ہی ایک ایسا مداح اور نیاز مند پیدا کر لیا تھا جو اس کی خواہش کے احترام میں اس کی قبر پر کتبہ نصب کروا رہا ہے ورنہ یہاں کتنوں کو کتبہ نصیب ہوتا ہے ۔۔ ؟

حلقہ یارانِ وطن کی طرف سے یونس آدیب نے ساغر کی یاد میں پاکستان سینٹر میں ایک بھرپور جلسہ کروایا۔ صدارت صوفی تبسم کی تھی اور ظہیر کاشمیری اور اے حمید نے مضامین پڑھے۔ بعد میں غلام علی پرویز مہدی اور کچھ دوسرے گلوکاروں نے ساغر کا کلام سنایا۔ اس بے حس دور میں کسی مرنے والے کو اتنا ہی یاد کر لیا جائے تو صد شکر ہے۔

امروز ۔ ۸/۷ ۔ ۷۶

ساغر صدیقی کے چہلم پر اس کے ایک نیاز مند نے جو کہ نہ شاعر ہے نہ ادیب، گوالمنڈی میں اس کی پان سگریٹ کی دکان ہے ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام کیا۔ ایصالِ ثواب کے لیے نیاز بانٹی اور گوالمنڈی چوک میں شامیانے لگا کر اور کرسیاں بچھا کر نہایت ٹھاٹھ سے مشاعرہ منعقد کروایا۔ مشاعرے کے پوسٹر تمام شہر میں چسپاں کروائے اور ہر معروف اور غیر معروف شاعر کا نام اس میں شامل کیا۔ مشاعرے کی صدارت صوفی تبسم نے کی اور یہ مشاعرہ رات ۹ بجے شروع ہو کر تقریباً دو بجے رات کو اختتام پذیر ہوا۔ اگرچہ اشتہار میں درج سبھی شاعر تو نہ آئے تاہم بہت سے معروف شاعروں نے شرکت کی۔ پنجابی، اردو اور حتیٰ کہ سرائیکی کے ایک شاعر نے بھی ساغر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ شاعر خالصتاً روایتی انداز کا تھا اور بہت برسوں بعد لاہور میں ایسی کوئی تقریب ہوئی تھی جسے واقعتہً عوامی کہا جا سکتا تھا۔ اگرچہ کثرتِ استعمال سے عوامی لفظ اتنا پٹ چکا ہے کہ اس کا اصل حسن کجلا گیا ہے۔ مگر یہاں اس کی بھرپور کیفیت موجود تھی۔ مشاعرے کا منتظم اپنی پان سگریٹوں کی دکان سے اٹھتا اور سٹیج پر موجود لوگوں اور کرسیوں پر

پر بیٹھے مہمانوں کی آؤ بھگت کرتا۔ اس نے وہی کتے چونے سے لپی ہوئی صدری اور شلوار پہنی ہوئی تھی۔ ایک شاعر کا نام پکارا گیا تو وہ پیچھے سے تکے کبابوں کی دکان سے اٹھا، ہاتھ جھاڑے اور دھوتی کو جھٹکا دیا۔ ہجوم کو چیرتا ہوا بڑھا اور سٹیج پر شعر سنانے چڑھ گیا۔ بہرحال ساغر کی زندگی جتنی بھی قابلِ رحم رہی ہو اس کی موت لائقِ رشک ہے۔ ابھی تک اس کی یاد منائی جا رہی ہے اور اس میں بھی ایسے لوگ پیش پیش ہیں جن کا شعر و ادب سے کوئی واضح تعلق نہیں ہے

امروز — ۹/۴/۹



بڑا اندھیرا ہے

ساغر صدیقی مرگیا! مجھے اس کی موت پر اس لیے حیرت نہیں ہوئی کہ وہ برسوں سے برائے نام ہی زندہ تھا۔ اس نے زندگی کے تمام ناطے خود اپنے ہی ہاتھوں توڑ دیے تھے۔ صرف سانس کی ڈوری باقی تھی، جسے وہ مسلسل مدہوشی کے سہارے روکے ہوئے تھا۔ سو اسے ٹوٹتے کیا دیر لگتی، ٹوٹ گئی! مگر وہ بہت سخت جاں نکلا۔ اتنے دن زندہ رہ گیا، اسی کا حوصلہ تھا۔

پچھلے چند برسوں میں وہ جب بھی نظر آیا، میں نے سب سے پہلے اس کی موت کے بارے میں ہی سوچا۔ ایک بار اس سے پوچھا بھی کہ ساغر بھائی آپ زندہ کیوں ہیں؟ اس نے اپنی سُرخ انگارہ سی آنکھوں سے مجھے گھورا اور کہنے لگا، چھوٹے میاں یہ تو معلوم نہیں۔ ساغر صدیقی ہمیشہ میرا نام بھول جاتا تھا اور ہر بار مجھے کسی نئے القاب سے پکارتا۔ میری اس کی پہلی ملاقات کوئی بارہ سال پہلے رائل پارک میں ہفت روزہ "آتش" میں ہوئی تھی۔ میں اُن دنوں وہاں "دہاڑی" پر کام کر کے اپنی فیس کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ ساغر اکثر شام ڈھلے چراغِ بادہ جلانے وہاں آجاتے تھے۔ ان دنوں ان کا عشق تازہ تھا اور آتش جواں۔ پھر یوں ہوا کہ آتشِ شوق بھڑکتی رہی اور ساغر اس میں جل کر راکھ ہوگیا۔ سیاہ لباس اپنایا اور گھر بار چھوڑ شہر میں بسیرا کرلیا، گویا

خوشبوؤں کے بھید جو پائے
گھر کو چھوڑے بن میں جائے
ہر کوئی کیسے بن میں جائے
ہر کوئی کیسے پا سکتا ہے خوشبوؤں کے بھید!
خوشبوؤں کے بھید کو پائے
ہنستے بستے گھر کو چھوڑ کے جو بھی بن میں جائے
سُونے بن کی تاریکی میں کالے راس رچاتے ہیں

ہر کوئی کیسے جان کے ان سے

اپنی جیب چٹائے

خود ان سے ڈسوائے

ہر کوئی کیسے پا سکتا ہے خوشبوؤں کے بھید

ساغر خوشبوؤں کے بھید پانے گھر سے نکلا. برسوں سُونے بن میں کالے ناگ اس کی جیب پر ڈستے رہے پھر موت سے صرف تین روز پہلے اپنے گھر واپس چلا گیا. اور مجھے اس بات پر حیرانی ہے کہ مرنا تو عام سی بات ہے لیکن ساغر گھر کیوں واپس چلا گیا.

اخباروں نے ساغر صدیقی کی موت کی خبر بڑے نمایاں انداز میں شائع کی ہے. لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ ساغر کیوں مر گیا یا وہ اتنے دنوں تک زندہ کیوں رہا کہ اگر کوئی یہ سوچ لیتا تو شاید وہ اتنے دنوں تک زندگی کی اذیت برداشت کرنے کو زندہ نہ رہتا.

کوئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ساغر صدیقی ریڈیو سٹیشن جا رہا تھا اور چوکیدار اسے اندر نہیں جانے دے رہا تھا. مجھے دیکھ کر چوکیدار نے فریاد کی کہ یہ فقیر اندر جانے پر مصر ہے میں ساغر کو اپنے ساتھ لے گیا. وہ ان دنوں بہت پریشان تھا. ریڈیو والوں سے اپنے گیتوں اور غزلوں کی رائلٹی مانگنے گیا تھا. لیکن آدھے راستے سے واپس ہو گیا. میں نے کہا چلو بات کرتے ہیں تو کہنے لگا، اندر دل ڈوبتا ہے. واپس جاؤں گا اور وہ چلا گیا.

پھر ایک دن داتا دربار کے قریب ملاقات ہوئی. وہ مدہوشی میں گُم تھا. میں نے کہا چلو کھانا کھائیں. کہنے لگا تمہارے بہت پیسے خرچ ہو جائیں گے. مجھے ایک روپیہ دے دو میں دھواں کر لوں گا.

ساغر سے مجھے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ وہ اتنی دھوم دھام سے زندہ رہا اور اس قدر خاموشی سے مر گیا. مرنے سے بیشتر اس نے زندگی سے تمام رشتے توڑ کر اپنوں سے ناطے بحال کیے اور پھر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا. اس نے زندگی بھر کسی کا احسان نہیں لیا. اپنی خواہشات

اور ضروریات محدود سے محدود تر کرتا چلا گیا۔ اس نے اپنے پیچھے بھی کوئی نہیں چھوڑا جس کے لیے سماجی اور ادبی انجمنوں کو سرکاری وظیفہ دلانے کی کوشش میں بیانات دینا پڑیں۔ زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ بڑا متضاد تھا کہ ایک جگہ وہ کہتا ہے۔

چراغِ طُور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
میرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ موت سے تین دن پہلے انسان کو منکر نکیر نظر آتے ہیں۔ شاید ساغر کو بھی نظر آئے ہوں اور وہ اپنے گھر واپس چلا گیا ہو لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ منکر نکیر اسے کس کے بھیس میں نظر آئے تھے۔ میں سوچنا اس لیے نہیں چاہتا کہ خود سے خوف کھاتا ہوں کہ تصور میں بہت سے شفاف چہرے اُبھر آئیں گے۔

ساغر کا عشق بھی اختر شیرانی کے عشق کی طرح اسرار بن کر رہ گیا ہے۔ شاید اسے بھی کوئی نہ جانتا ہو جس نے ساغر کو توڑ دیا تھا اور وہ ساری زندگی کانچ کی کرچیں چننے کی کوشش میں اپنے ہاتھ زخمی کرتا رہا اور جب تمام انگلیاں خُون میں لتھڑ گئیں تو خاموشی سے اپنے گھر جا کر مر گیا۔ لیکن لاہور کے باغوں اور فٹ پاتھوں کی اداسی کون دور کرے گا کہ غالبؔ نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مساوات۔ ۲۱ ہی ۷ء

انسانیت کا فیصلہ

ادبی عدالت نے معاشرہ کو

ساغر صدیقی کا

قاتل

قرار دے دیا!

لاہور میں ۲۰ اگست کو ایک ادبی عدالت کے ججوں نے فیصلہ دیا کہ درویش شاعر ساغر صدیقی مرا نہیں بلکہ معاشرے نے اسے قتل کیا ہے۔ اس کے ہمعصر ادیب، دانشور شاعر اور پبلشر جو اس کے مقابلے میں بونے نظر آتے ہیں کسی طرح بھی اس کے قتل سے بری الزمہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اس کے ہمعصر دانشور خود تو گلچھرے اڑاتے رہے اور ایک ایسے شخص کو جو سراپا تخلیق اور عظیم فنکار تھا، حالات کے بے رحم تھپیڑوں کے سپرد کر دیا۔

ججوں نے جن میں پروفیسر سکین حجازی، پروفیسر سجاد باقر رضوی اور خاور مرزا شامل تھے کہا کہ یہ ادبی عدالت ہے اور معاشرے پر ساغر صدیقی کے قتل کا الزام عاید کیا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ انسانیت کی تعزیرات کے تحت کیا گیا ہے۔ اگرچہ ساغر کی موت کی کسی قدر ذمہ داری اس کی ذاتی زندگی پر بھی عاید کی جا سکتی ہے مگر اس کی زندگی معاشرے کے دوسرے افراد سے مختلف تھی۔ اس کا رویہ بھی مختلف تھا۔ اس نے زندگی کے بے رحم ہاتھوں میں تباہ حال ہونے کے باوجود انتقامی رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ چپ سادھ لی۔ اس کی خاموشی کو کسی بھی صورت میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرہ کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ججوں نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ ہم سب نادم ہیں کہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جہاں فنکار اور تخلیق کار کی قدر نہیں کی جاتی۔ ساغر معاشرہ کے ہاتھوں قتل ہوا اور امر ہو گیا۔ اب اس کی قبر پہ کتبہ لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ محلے محلے اور گلی گلی معاشرے کی بے حسی کا کتبہ لگانا چاہیے۔ یہ ادبی عدالت ایوان ادب و ثقافت نے لگائی تھی۔ صوبائی وزیر تعلیم کی پارلیمانی سیکرٹری بیگم ریحانہ سرور خصوصی ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ معاشرے

پر ساغر صدیقی کے قتل کا استغاثہ آفتاب احمد نے پیش کیا۔ استغاثہ کے گواہوں میں یونس ادیب ، اعجاز رضوی، محسن سسوانی شامل تھے اور وکلاء صفائی کے طور پر عارف ریحان اور ایم عزیز قریشی پیش ہوئے۔

آفتاب احمد نے استغاثہ میں کہا "لوگ کہتے ہیں ساغر مر گیا لیکن وہ مرا نہیں بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اس کے قتل کا ذمہ دار معاشرہ ہے جس نے اسے زندہ رہنے کا حق دیا بھی تو ایسے کہ وہ مُردوں سے بدتر حالت میں جیتا رہا۔ معاشرہ پر قتل کا الزام لگانے سے پہلے معاشرہ کی تعریف پیش کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ اور تحقیق کے مطابق معاشرہ ایک خود مختار اور آزاد آبادی کو کہا جاتا ہے جو اپنی علاقائی اور ثقافتی حدود میں اپنی انفرادیت کے ساتھ مستحکم ہوتا ہے۔ معاشرہ انسانوں کے درمیان ایک سماجی معاہدہ کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اس سماجی معاہدے کے مطابق انسان زندہ رہنے کے لیے دوسرے انسان کے تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ انسان کے ذمے کچھ حقوق اور کچھ فرائض ہوتے ہیں جنہیں ادا کر کے وہ دوسروں کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ معاشرے کے اجزائے ترکیبی حکومت کے ادارے سماجی ادارے، خاندان، قوانین اور روایات ہیں جن کا ایک دوسرے پر انحصار لازمی ہے۔ ایک مستحکم معاشرے کے لیے ان اجزائے ترکیبی کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی کمزور پڑ جائے تو معاشرے میں جھول اور خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ تمام اجزائے ترکیبی کسی نہ کسی صورت میں کمزور ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں استحکام نہیں اور اس عدم استحکام کے باعث ظلم و جبر اور استحصال کے واقعات جنم لیتے ہیں۔ چونکہ ان تمام اجزائے ترکیبی میں استحکام نہیں اس لیے ساغر پر ظلم ہوا۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جس سے اس کی زندگی مُردوں سے بدتر ہو گئی اور آخر کار ان حالات نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ قانون میں قتل کرنا اور قتل پر اُکسانا ایک ہی طرح کا جرم ہے۔ لہٰذا معاشرے کے جن افراد نے ساغر کا ذاتی مفادات کے حصول یا اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے اپنی شخصیتوں کی گرتی ہوئی دیواریں محفوظ رکھنے کے لیے استحصال کیا وہ اس کے قاتل ہیں لیکن ساغر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس کی زبردست قوتِ ارادی نے اسے ان دنوں بھی اسے ذہنی طور پر زندہ رکھا۔ اس پہ ہر طرح کے تیر چلائے جا رہے تھے۔

استغاثہ کے گواہ یونس ادیب نے کہا ساغر صدیقی ۱۹ جولائی کو موت کا شکار ہوا اس کے

مسلسل قتل کی داستان انتہائی المناک ہے مگر سانحہ عظیم تھا اس کی موت نے ہر ایک کو چونکا دیا ہے۔ ہر ایک محسوس تک کرنے لگ گیا ہے کہ اس پر کتنا بڑا ظلم ہوا۔ وہ شخص جو صرف تخلیق کے لیے وقف تھا اس طرح مارا جائے یہ احساس ہی ساغر کی عظمت کی دلیل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ساغر کی موت ایک شخص کی موت نہیں معاشرے نے خود کو قتل کیا ہے۔ اس کا یہ قتل ساغر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث بھی تھا اسے مشاعروں میں وہ داد ملتی تھی کہ ہمعصر اس کے رقیب بن گئے۔ وہ اس پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد جب اس کا بھائی لاہور میں قیام پذیر ہوا تو ساغر کی بھاوج نے ساغر کی شاعری کو اس کے نکھٹو ہونے کی دلیل قرار دیا۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنہیں ساغر جیسا تخلیق کار زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا اور خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی خاموشی دراصل بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی یہ طوفان اس کے اندر برپا تھا جسے سرد کرنے کے لیے اس نے نشے کو اپنا لیا۔ اسے نشے کی عادت ایک شاعر نے ڈالی تھی۔ اس کے بعد ساغر نے فلیمنگ روڈ پر آج کے ایک مشہور فلم ساز و ہدایت کار کی بال کاٹنے کی دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ دراصل ان دنوں ساغر صدیقی وہاں کے ایک رسالے "تصویر" میں ملازم تھا۔ مگر اس رسالے کے بند ہونے پر ساغر بیکار ہو گیا۔ انہیں دنوں ساغر کی شہرت فلمی دنیا میں پہنچی اور موسیقار مبارک علی خاں اسے انور کمال پاشا کے پاس لے گئے جنہوں نے ساغر کو فلم "دو آنسو" میں گانے لکھنے کا کام دے دیا۔ مگر وہاں بھی لوگ ساغر سے جلنے لگے ساغر درویش کا روپ تو دھار ہی چکا تھا چنانچہ پبلشروں نے جو اس کی شاعری پر کوٹھیوں کے مالک بن گئے دو دو روپے کے عوض اس سے غزلیں لکھوائیں۔ پھر ساغر اخبار مارکیٹ کے ایک اصطبل میں رہا۔ یونس ادیب نے کہا اس پر سب سے زیادہ ظلم رائٹرز گلڈ نے کیا جن دنوں وہ ہسپتال میں خون تھوک رہا تھا کوئی اس کی عیادت کو بھی نہ آیا۔

اس سے پہلے اس پر فالج گرا تو اس کی امداد کے لیے ایک کشکول کی قیمت سے زیادہ رقم اکٹھی نہ ہو سکی۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو والوں نے بھی اس کی غزلوں سے شہرت حاصل کی مگر اسے ایک پائی نہ دی۔

انہوں نے کہا معاشرہ ساغر صدیقی کے قتل پر لہو لہان ہو گیا ہے یہ خون پھر آستیں سے رس

رہا ہے۔ وہ آزادی پسند تھا مگر اس کی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اس نے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا اور ان بے انصافیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔

سید اعجاز رضوی اور محسن سمساوی کے نام پکارے گئے گواہ موجود تھے۔ جس پر مستغیث آفتاب احمد نے کہا یوں لگتا ہے کہ معاشرہ نے انہیں رشوت دے کر توڑ لیا ہے۔

صفائی میں ایم عزیز قریشی نے کہا چار میں سے تین گواہ عدالت میں نہیں آئے لہذا انہیں قابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر کے طلب کیا جائے۔ وکیل صفائی نے کہا ساغر شاعر کا نام نہیں عرفیت ہے عرفیت پر مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ استغاثہ کسی فرد پر ہو سکتا ہے پورے معاشرے پر نہیں کیونکہ ایک تو معاشرے کو عدالت کا خوف نہیں۔ اس لیے یہ استغاثہ جھوٹا ہے اور دائر کرنے والوں نے عدالت کو دھوکا دیا ہے جس پر استغاثہ دائر کرنے والوں کو دھوکا دہی کے الزام میں گرفتار کیا جائے۔ وکیل صفائی نے کہا معاشرے میں جج بھی شامل ہیں جس سے وہ فریق بن گئے ہیں۔ قانون کی رو سے کوئی فریق اپنے مقدمے میں جج نہیں بن سکتا۔ وکیل صفائی نے کہا خدا جب بندوں کو دنیا میں بھیجتا ہے تو عقلِ سلیم سے بھی سرفراز کرتا ہے اور نیکی اور بدی کے راستے بھی بتا دیتا ہے۔ اب یہ بندے پر ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ منتخب کرتا ہے۔ ساغر نے اپنے لیے نیکی کا راستہ منتخب نہیں کیا۔ ساغر نے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی فرار کیا اور معاشرے کی زیادتیاں بھولتے ہوئے خود کو فراموش کر دیا۔ اس نے اس خود فراموشی کے لیے نشے کا سہارا لیا اور موت کا شکار ہو گیا۔ وکیل صفائی نے موقف اختیار کیا کہ ساغر صدیقی نے وہ رویہ اختیار کیا جسے جرأت مندانہ نہیں کہا سکتا چنانچہ جرأت کے فقدان نے اس شاعر کو جامد و ساکت کر دیا اور وہ زمانے کا ساتھ نہ دے سکا حالانکہ انسان کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جدوجہد کو اپنے لیے ایک راہ کے طور پر متعین کرے۔ معاشرہ بھی متحرک افراد کا ساتھ دیتا ہے جامد اور ساکت افراد کا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ساغر کی موت زندگی کی تلخ حقیقتوں سے منہ موڑنے، فرار حاصل کرنے اور ساکت اور جامد ہو جانے کی داستان ہے اور معاشرہ کو ایسے شخص کی موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس لیے استغاثہ واپس لے لیا جائے۔ اس موقع پر دوسرے وکیل صفائی عارف ریحان، پروفیسر سجاد باقر رضوی اور خاور مرزا نے بھی خطاب کیا۔

صوبائی وزارت تعلیم کی پارلیمانی سیکرٹری بیگم ریحانہ سرور نے کہا معاشرہ آسمان سے نہیں اترتا یہ ہم سب کے وجود کی وجہ سے تشکیل پاتا ہے۔ چنانچہ معاشرے کی ہر کوتاہی اور خرابی کے ہم سب ذمے دار ہیں اور جب اس کی اصلاح ہوگی اصلاح ہم سب مل جل کر کریں گے۔

انہوں نے کہا ہم سب کو محنت اور لگن کے ساتھ معاشرے کی ان خامیوں کو دور کرنا چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری ویسے تو ہم سب پر عاید ہوتی ہے مگر دانشوروں کو سب سے اہم کردار انجام دینا پڑتا ہے۔ اس لیے انہیں اپنی کوششیں تیز تر کر دینی چاہئیں۔ انہوں نے اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ معاشرے میں علم و ادب کی ترقی و ترویج کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی مگر اس کام کے لیے بھی اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت دانشوروں کی بہتری کی خواہاں ہے ہمیں چاہیے کہ ہم سب جدوجہد کر کے حکومت کے اس کام کو آسان تر بنا دیں۔ بیگم ریحانہ سرور نے کہا کہ آج ساغر صدیقی ہم میں نہیں مگر ایسی شخصیتیں مرتی نہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ساغر بھی اپنے فن اور شاعری کی اس روشنی کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا جسے اس نے دُور دُور تک پھیلا دیا ہے۔

محمود زماں

مساوات ۱۴/۸/۷۴

آہ! ساغر

ضیاء الحق محمد

موت کتنی ظالم ہے

ہم سے ہمارے پیاروں کو

ہماری آنکھ کے تاروں کو

چھین یوں لیتی ہے۔ جیسے

اُچک لیتا ہے دستِ گلچیں

گلشن کے ہر گلِ خوبصورت کو

اور ہمارے پاس

چند آہوں کے سوا

مرحوم کی یادوں کے سوا

رہتا کچھ بھی تو نہیں

سو گیا ہے جگائیں ساغر کو
آؤ مل کے منائیں ساغر کو
شہر میں پھیلے شب کا سناٹا
دے رہا ہے صدائیں ساغر کو
وہ تو لوحِ جنوں کا مالک تھا
کس طرح بھول جائیں ساغر کو
کاش "اے زندگی کی رقاصہ"
تیرا چہرہ دکھائیں ساغر کو
یاد کرتی ہے اب تجھے دنیا
ہائے کیسے بتائیں ساغر کو

سلیم بخاری

ظالم دنیا

ساغرنوں توں قبریں پایا
ہن کیوں تینوں یاد ایہہ آیا
ہن کی زندہ باد
نی دنیا
سدا رہویں گی یاد

—— طالب جالندھری



شہرِ سنگدل میں

ہر زمانے ہر عہد اور ہر شہر میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جیسے ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ موجود بھی ہوتے ہیں اور نہیں بھی۔ کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ مختصر سے عرصے میں کئی بار ان کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے اور کبھی برس گزر جاتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔ میرے لیے اس شہر میں ساغر صدیقی ان ہی لوگوں میں سے ایک شخص تھا۔ ایسے آدمیوں میں ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی یاد نہیں آتا کہ ان سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور کہاں ہوئی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلی بار یونس ادیب نے ملوایا تھا۔ ملاقات فلم کے علاقے میں ہوئی تھی یا

کسی درگاہ میں۔ بس ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے جیسے ایک صوفی اپنے کشف سے دوسرے صوفی کو پہچانتا ہے۔

ساغر نے اس شہر میں دو سطح پر زندگی بسر کی ہے۔ اس کی ایک حیثیت بگڑے اور مسخ معاشرے کے سامنے ایک ملامتی قبیلے کے فرد کی تھی اور دوسری سطح پر ہیبت نظامِ حکومت اور سنگدل نظامِ اقتصاد کے شکار کی۔ اس کا پہلا روپ خود مصلوب ہو کر ایک شہرِ سنگدل کو گداز کرنے کا روپ تھا اور اس کی زندگی کا دوسرا روپ ایسا ہے کہ اس شہر سے نفرت ہو جاتی ہے جس میں اس نے اذیت کے عالم میں زندگی بسر کی۔ ان حکومتوں کو بدل دینے کو جی چاہتا ہے جن کے عہد میں یہ دردمند شاعر عسرت کا شکار ہو کر مرا۔

کیا تھیں وہ باتیں جو کہنا چاہتے تھے وقتِ مرگ
آخری دم یار اپنے کن خیالوں میں رہے

منیر نیازی ۱۲ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یونس بھائی ! سلام مسنون

حضرت ساغر کے وصال کے بعد پتا چلا کہ آپ بھی مرحوم کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔
زہے قسمت ! کبھی مل بیٹھنے پر مرحوم کی یاد تازہ ہو جایا کرے گی۔ آپ سے اکثر ملاقات تو ہوتی رہی
لیکن اس موضوع پر کبھی گفتگو ہی نہیں ہوئی۔

فقیر اور بیگم فقیر قادری حضرت ساغر کے خاص الخاص عقیدت مندوں میں ......
جن دنوں میں موصوف "آستانہ قلندریہ" رنگ محل میں تھے۔ وہاں سے ہم دونوں بضد ہو کر
انہیں اپنے فقیر خانہ پہ لے آئے۔ صرف ایک رات بسر کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ فقیر بابا! میری
وجہ سے آپ کو اور بہن بانو کو تکلیف ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ میں آپ لوگوں کے آرام اور
سکون میں مخل ہوں۔ آپ لوگوں کو جو خدمت کرنی ہے کر دیں۔ لہٰذا میں وہیں پر ٹھیک ہوں
اور وہیں مجھ سے ملتے رہیے گا۔ پھر ہمارا یہی شعار رہا بیشتر دفعہ تو شہر میں مارے مارے بھی
پھرے لیکن اکثر ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔

جن دنوں میری کتاب "نغماتِ قادری" زیرِ طبع تھی تو ان دنوں میں مقامی طور پر "پاک لینڈ
پریس انار کلی" کے تھڑے پر براجمان تھے تو ہم دونوں میاں بیوی روزانہ بغرض زیارت
اور سلام حاضری دیا کرتے تھے۔ ہسپتال روڈ پر وینس پرنٹنگ پریس کے مالک حمید مرزا ہمارے
خاص عزیزوں میں سے ہیں۔ ان سے کہلوایا کہ ساغر صاحب سے کہیں کہ فقیر خانہ پر تشریف لے چلیں۔
فرمایا کہ ہاں قادری بابا! پرسوں چلیں گے۔ تشریف لائے دو دن قیام فرما کر پھر وہی بات
دہرائی۔ اچھا اب ذات تو منوں مٹی تلے سما گئی۔ محض ان کی بات اور صفات ہی پیشِ نظر
ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ناخدایانِ فن سے

ساغر تو دے رہا تھا ہر ایک کو دعائیں — کس کس کا نام لکھیں کس کس کو بھول جائیں
جو گذر رہی تھی اس پر کس کس کو ہم بتائیں — ساغر کی کسمپرسی کس کس کو ہم سنائیں

واجب ہے دوستوں پر ساغر سے پوچھ آئیں

فنکار تھا انوکھا، مزدور تو نہیں تھا — بکیس تھا، بینوا تھا، مغرور تو نہیں تھا
جل جاتا اک جھلک سے وہ طُور تو نہیں تھا — مجبوریوں کا مالک، مجبور تو نہیں تھا

مجبور کر گئی تھیں دنیا کی یہ ادائیں

شکوہ تو کر رہی تھی، ساغر کی زندگانی — دنیا کی نذر کر دی کیوں مدھ بھری جوانی
کس کا قصور تھا یہ، تھی کس کی مہربانی — پُتلا خلوص کا تھا، دیوانہ لامکانی

ساغر کو رو رہی تھیں خاموش التجائیں

راضی تھا ہر رضا میں بندہ تھا وہ رضا کا — افلاس کا ستایا، شاکر تھا وہ خدا کا
جس کے قلم نے اُگلا، ہر راز کربلا کا — حسینؑ کا پجاری، مداح تھا مرتضیٰؑ کا

یہ چلتے پھرتے لاشے پھر بھی اسے ستائیں

جب بھی قلم اٹھایا تعظیم دلرُبا میں — دیوانہ ہو گیا تھا توصیفِ مصطفےٰؐ میں
ثانی نہ ہو گا اس کا مضمونِ التجا میں — گو تھا خطا کا بندہ شامل تھا وہ عطا میں

جس کے قلم نے لکھیں محبوبؐ کی ثنائیں

احمد کا وہ ثنا خواں فریاد کر رہا تھا ہر ایک مہرباں کو وہ یاد کر رہا تھا
دنیائے آرزو کو برباد کر رہا تھا نہ جانے کس جہاں کو آباد کر رہا تھا
وہ پیکرِ محبت آؤ گلے لگائیں

ہوش و خرد سے اس کو محروم کہنے والو مرنے کے بعد اس کو مرحوم کہنے والو
فنِ ادب کا اس کو مفہوم کہنے والو خادم مرا بلکہ مخدوم کہنے والو
کوئی بھی سن نہ پایا مغموم کی صدائیں

میں فقیر قادری ہوں ساغر سے ہے عقیدت ساغر مری شریعت ساغر مری طریقت
ساغر ہی معرفت ہے ساغر مری حقیقت ساغر سے مجھ میں مستی، ساغر شرابِ الفت
میری حقیر غزلیں ساغر کی خادمائیں

نیاز مند — فقیر قادری



چاک داماں

اور اب تم کہاں جا رہے ہو؟

جہاں خدا لے جائے گا، جب مجھے کوئی دھندا ملتا ہے، میں اس میں جت جاتا ہوں اور جب کام نہیں کر سکتا تو بھیک مانگتا ہوں، مگر صرف روٹی ــــ،

ساغر یہ سن کر اچھل پڑا اور اس کی ہتھیلی پر سگریٹ سے نکلا ہوا تمباکو گرتے گرتے بچا پھر وہ تیسری سیڑھی سے اتر کر نیچے آگیا اور میرے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر بولا۔

"مجھے پھر پڑھ کر سناؤ!"

ان دنوں وہ گول چھت والے ریڈنگ روم کی عقبی سیڑھیوں میں رہتا تھا. پاکستان کو قائم ہوئے کئی برس ہو چکے تھے اور لوگوں نے ہندوؤں سکھوں کے بڑے بڑے مکان اپنے نام کرا لیے تھے. ساغر صدیقی ہجرت کر کے امرتسر سے آیا تھا مگر وہ ان ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں سے ایک تھا جو شرافت میں مار کھا گئے تھے اور ٹوٹے ہوئے مکانوں، ادھ جلی شہ نشینوں، مندروں اور سیڑھیوں میں دن گذار رہے تھے. میونسپل کارپوریشن کا یہ ریڈنگ روم پرانے شہر کی فصیل کے ساتھ جس باغ میں تھا وہاں گلاب کھلتے تھے. ان کے علاوہ وہاں اور کوئی پودا نہیں تھا. سکھ طرزِ تعمیر کی یہ چھوٹی سی پیلی عمارت صرف ایک کمرے پر مشتمل تھی۔ عقبی سیڑھیاں گول چھت پر جاتی تھیں اور انہیں سیڑھیوں میں حیدر بھی رہتا تھا جو کارپوریشن کا ملازم تھا. مگر قواعد کے مطابق اسے یہاں رہنے اور راتیں گذارنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ بھی قیامِ پاکستان کے بعد بمبئی سے آیا تھا اور دوسرے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح شرافت میں مار کھا گیا تھا.

جہاں اب ٹیکسی سٹینڈ ہے پہلے وہاں سے نہر گزرتی تھی اور اس نہر کے کنارے گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں چینیوں جیسی شکلوں والے کچھ خاندان آباد تھے. گول چھت والی عمارت کے دوسری جانب آٹھ دس کچھ بوڑھے کچھ جوان لوگ رہتے تھے ان کے ناموں کا کسی کو پتا نہ تھا شاید غریب کے علاوہ ان کا اور کوئی نام تھا بھی نہیں. ان میں سے بعض درخت کے نیچے بچھی چٹائیوں پر مسلسل لیٹے اور کھانستے رہتے اور جب ان کی کھانسی رک جاتی تو وہ محنت مزدوری کرنے نکل جاتے تھے. حیدر نے ساغر کو سیڑھیوں میں شب بسری کی اجازت دی ہوئی تھی. چونکہ کارپوریشن کے قواعد کے مطابق اس عمارت میں رہائش اختیار کرنے کی ممانعت تھی اس لیے ساغر صدیقی اور حیدر رات کو سیڑھیوں کی بتی نہیں جلاتے تھے. موم بتی کی روشنی میں حیدر منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھتا اور ساغر صدیقی شعر لکھتا. دن بھر وہ سڑکوں پر پھرتا رہتا اور رات کو چپکے سے یہاں آجاتا اور تیسری سیڑھی پر بیٹھ کر کالے سیاہ دھوئیں کے مرغولوں میں ہلکورے لیتا. میں ریڈنگ روم میں اخبار

پڑھنے آتا تھا وہیں مجھے معلوم ہوا کہ سینماؤں کے اختتام پر جو قومی نغمہ سنایا جاتا ہے وہ ساغر صدیقی کی آواز میں ہے۔ اسے لکھنے والا بھی وہی ہے اور وہ عقبی سیڑھیوں میں رہتا ہے۔ ان دنوں وہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتا تھا۔ کالے کپڑے پہنے اور بال بڑھائے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی مگر اس نے جوگیوں والا روپ کس لیے اختیار کیا؟ اس راز کو کوئی نہیں جانتا۔ جب میں اس سے ملاقات کے لیے عقبی سیڑھیوں کی جانب بڑھا تو ایک شخص نے بتایا کہ ساغر صدیقی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ تھانیدار کو شک تھا کہ گول چھت پر لوگ جُوا کھیلتے ہیں۔

ابھی شہر میں ایسے بیشمار لوگ موجود تھے جنھوں نے ساغر کو سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے دیکھا تھا۔ شاید وہ پہلے کنگھیاں بناتا تھا اور لوگ کہتے ہیں وہ شام کو بالوں میں کنگھی پھیر کر انار کلی کے چوک میں آیا کرتا تھا مگر ——— اب وہ دیکھنے والوں کے لیے جوگی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ملنے والے جو اسے ساغر بابا کہتے تھے، اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، حیدر کہتا تھا۔

اگر اسے سانپ ڈس لے تو الٹا سانپ مر جائے گا۔

مگر کیوں؟

نشہ بہت کرتا ہے، اس کی رگوں میں خون نہیں، مستی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں ہر روز علی الصبح منٹو پارک سے ہو کر گھر جانے سے پہلے جب اخبار پڑھنے کے لیے ریڈنگ روم میں داخل ہوتا تو وہ وہاں بڑے انہماک سے اخبار پڑھتا نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کہتا۔

سیدزادے! بڑی ترقی کرے گا۔ سب سے طاقت ور ملک بن جائے گا۔

پھر ہم باہر نکل آتے اور تھانے کے ساتھ والی دکان کے تھڑے پر سماوار میں گڑ کی چائے بیچنے والے کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔

ایک روز میں منٹو پارک سے ہو کر ریڈنگ روم میں پہنچا تو پتا چلا کہ دوسری جانب جو آٹھ دس کچھ بوڑھے کچھ جوان مزدور رہتے تھے، ان میں سے ایک چل بسا ہے، ساغر صدیقی لاش کے پاس

مغموم بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا "سیدزادے" اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا چاہیے، کوئی بات نہیں اگر یہ علاج کے بغیر مر گیا ہے، مگر تم دیکھو گے کہ ملک بڑی ترقی کرے گا۔

اس غریب کے جنازے میں جس کے نام کا ہمیں علم نہیں تھا، ساغر صدیقی، حیدر، میں اور دوسرے مزدور تھے، جن میں سے کئی مسلسل کھانس رہے تھے۔ قبرستان سے واپس آنے کے بعد ہم کافی دیر تک درخت کے نیچے بچھی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھے رہے۔ میل سے ان کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ شام ہوئی تو نہر کے کنارے گھاس پھوس کی جھونپڑیوں سے چینیوں جیسی شکل والی ایک لڑکی نکلی، اس کے ہاتھ میں کڑوے تیل کا چراغ تھا۔ پتا نہیں وہ کس زبان میں بات کر رہی تھی۔ ساغر صدیقی نے اس سے چراغ لے لیا اور چٹائی کے ایک سرے پر پڑی اینٹ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہی کہتی ہے، جہاں کوئی مر جائے وہاں رات بھر چراغ جلتا رہنا چاہیے"۔

پھر وہ یہاں سے چلا گیا اور کئی سال باغوں، فٹ پاتھوں، مزاروں اور تکیوں میں گذر گئے۔ کبھی کبھی وہ سڑک پر یا برہنہ چلتا نظر آتا تو رک کر دھوتی کے ڈب سے بوسیدہ کاغذوں کا پلندہ نکال کر تازہ غزلیں سناتا، اس کی صحت خراب اور باتیں بے ربط ہوتی گئیں۔

جن دنوں وہ سیتلا مندر کے پچھواڑے سرائے کے ایک کمرے کے باہر برآمدے میں مقیم تھا اس نے "فرشتوں کا کھانا" کھلایا۔ اینٹوں کے بنائے ہوئے چولہے پر کانسی کے کٹورے میں اس نے قلیل مقدار میں کئی سبزیاں ایک ساتھ ڈالی ہوئی تھیں ان میں انڈے بھی تھے، مکھن بھی، گھی بھی سگریٹوں کے خالی پیکٹ چولہے میں جلتے جلتے بجھ جاتے تو وہ مسلسل پھونکیں مارتا جب یہ معجون پک گیا تو اس نے کہا۔

سیدزادے! تم بھی کھاؤ، فرشتوں کا کھانا ہے۔،

فرشتوں کا کھانا اس وقت پکتا تھا جب اسے کسی مشاعرے سے کچھ روپے مل جاتے یا کوئی مداح مٹھی میں کچھ تھما دیتا اور وہ بازار سے ہر سبزی خریدنے کی کوشش کرتا، اور کسی نہ کسی ملنے والے کو زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔

ایک روز فرشتوں کا کھانا پکاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا!

سیّد زادے! پتا ہے جہاں میں بیٹھا ہوں اس کے نیچے کیا ہے ؟

کیا ہے ؟

پریوں کا تخت ہے اور وہ جو عمارت گئوشالہ کے پاس ہے اس کے نیچے کا منظر بھی میں نے دیکھا ہے.

خوبصورت شعر کہنے والا مجھے جو کچھ بتا رہا تھا میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا. اسے شہر کی ہر عمارت کے نیچے کچھ نہ کچھ نظر آنے لگا تھا اور اس کے بعد دن گذرنے کے ساتھ اس کی باتوں کا سلسلہ بے جوڑ ہوتا گیا. اکثر لوگ اسے پاگل سمجھنے لگتے تھے. اس کی باتیں سن کر ہنس دیتے تھے. پتا نہیں یہ شعر کا جادو تھا جس میں وہ ہوش گنوا بیٹھا، یا کوئی اور غم جو اسے اندر ہی



اندر جلا رہا تھا، بھسم کر رہا تھا

شدید قسم کی معاشی ناہمواری اور اپنے لیے راستہ بنانے کی کوشش میں ہم سفروں کو موت

کے گھاٹ اتارنے والے اس دور میں کئی تُک بند شاعروں نے سمن آباد اور دوسرے علاقوں میں خوبصورت مکان بنا لیے تھے۔ انہوں نے فلموں میں بھی ساغر کو چلنے نہ دیا۔ اس نے پاکستان کی کئی ابتدائی فلموں کے لیے گیت لکھے تھے۔ شعور اسے ریڈیو اسٹیشن بھی لے گیا مگر وہ اپنے اس ہنر کو زندگی گزارنے کا ذریعہ نہ بنا سکا۔ پھر پاکستان کا نیا قومی ترانہ بن گیا اور لوگ یکسر بھول گئے کہ سینماؤں میں اس ترانے سے پہلے کس کی آواز گونجتی تھی۔

جن دنوں اخبار مارکیٹ تعمیر نہیں ہوئی تھی وہ ان دنوں یہاں راتیں گذارتا تھا۔ میں جب رات گئے ہسپتال روڈ سے گذرتا تو وہ مجھے دیے کی مدھم روشنی میں اکثر شعروں کے چراغ روشن کرتا دکھائی دیتا۔ جہاں وہ سوتا تھا اس کے قریب گھوڑے بندھے ہوتے تھے اور فضا میں عجیب سی بدبو ہوتی تھی۔ گندے کمبل میں ابھری ہوئی ہڈیوں والے شانے چھپا کر وہ ٹانگیں سکیڑتا اور میرے لیے بیٹھنے کی جگہ بناتا، پھر اس کی آواز بلند ہوتی۔

یہ تیری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاک داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخ مرتب یہ حشر ساماں سے لوگ ساقی

لگا کوئی ضرب اس ادا سے کہ ٹوٹ جائیں دلوں کی مہریں
تری قسم تنگ آ گئے ہیں سکوتِ پنہاں سے لوگ ساقی

یہ جگنوؤں کی چمک پہ بھی اب سنبھال لیتے ہیں اپنا خرمن
مجھے یقیں ہے کہ ڈر گئے ہیں شبِ چراغاں سے لوگ ساقی

اگر یہ اندھیرا اور کچھ دن رہا تو ایسا ضرور ہوگا
الجھ پڑیں گے بنامِ حالات زلفِ جاناں سے لوگ ساقی

کوئی نیا رنگ بخش اس کو، کوئی نئی روح پھونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی

خیال ہے میکدے میں اک بار اور شعلوں کا راج ہو گا
شنید ہے انتقام لیں گے نشاطِ دوراں سے لوگ ساقی

میرے لیے یہ بات حیرت ناک تھی کہ عام زندگی میں جو باتیں وہ کرتا تھا ان کے سلسلے بے ربط ہوتے تھے۔ بعض اوقات وہ گھنٹوں خود کلامی میں مصروف رہتا۔ شہر کی عمارتوں کے نیچے چھپے ہوئے مندروں، خزانوں اور جادو کے پتھروں کی باتیں اس کے ملنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جب وہ شعر سناتا تو ان میں ذہانت اور شعور کے سلسلے پوری طرح واضح نظر آتے تھے۔ یوں بھی شعر کے شعور نے ابھی اسے سنبھالا ہوا تھا اور قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ کئی بار اسے مسلسل فاقوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دو دو روپے میں غزلیں بیچنا پڑیں۔ علم و ادب کے اس نام نہاد شہر میں کئی لوگ اس سے غزلیں خرید کر اپنے نام سے چھپواتے رہے۔

ایک مرتبہ وہ ویام شالہ کے پاس والے تکیے میں بیٹھا تھا کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے تکیے کو گھیرے میں لے کر اندر بیٹھے درجنوں افراد کو حراست میں لے لیا۔ ساغر صدیقی ایک درخت کے نیچے دھوتی کے ڈب سے میلے کچیلے کاغذ نکالے دیکھ رہا تھا۔ تھانیدار نے اسے بھی نہ چھوڑا اور لاکھ منت سماجت کے باوجود اسے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ جب مجھے اس کا پتا چلا تو میں نے اپنے اخبار میں اس کی گرفتاری کی خبر چھاپ دی اور اس میں لکھا کہ علم و ادب کے شہر لاہور میں ساغر صدیقی کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اگلے دن یہ بات حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ کیونکہ جب اسے دوسرے حوالاتیوں کے ساتھ عدالت میں پیش کیا گیا تو لاہور میں رہنے والا کوئی شخص اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ ساہیوال کے ایک ایڈووکیٹ نے اس کی ضمانت دی اور کافی دیر تک مقدمے کا پیچھا کیا۔ لاہور کے لوگ اس وقت بھی اس کی مدد کو آگے نہ بڑھے جب وہ سرکلر روڈ کے ایک چھاپہ خانہ کی ڈیوڑھی میں فالج کی گرفت میں آ گیا تھا۔ اخبار میں اس کی علالت کی خبر شائع ہونے کے بعد لالہ موسیٰ، گجرات اور چند دوسرے شہروں کے لوگوں نے اس کے علاج کے لیے عطیات دیے۔

رائٹرز گلڈ نے بھی اسے فراموش کیے رکھا اور چند ادیبوں کی اپیل پر ساغر صدیقی کے لیے شاید تین سو روپے مخصوص کیے۔ انہی دنوں وہ مجھ سے ملا۔ اس کا داہاں ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔

میں اسے کافی دیر تک قائل کرتا رہا کہ اسے ہسپتال میں داخل ہو کر باقاعدگی سے اپنا علاج کرانا چاہیے مگر وہ مُصر رہا کہ اس کے لیے لوگوں نے جو عطیات دیے ہیں وہ اس کے حوالے کر دیے جائیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہ رقم اسے مل گئی تو وہ بے خودی کو اور بڑھائے گا۔ یوں بھی سارے عطیات احمد ندیم قاسمی کے پاس تھے۔

میں نے کہا:

ساغر! حاجی یوسف کے ہسپتال میں تمہیں دو تین ماہ ٹک کر علاج کرانا چاہیے۔ میں نے بات کر لی ہے۔ لوگوں نے جو پیسے دیے ہیں ان سے تمہارے لیے ادویات خریدی جائیں گی۔

نہیں سیّدزادے، اس نے کہا۔ تم آدھے پیسے سیلاب فنڈ میں دے کر باقی رقم مجھے دے دو، میں کاغذ چھاپوں گا؛

کاغذ چھاپنے سے اس کی مراد کتاب کی اشاعت سے تھی۔

بعد میں جب اسے پیسے ملے تو اس نے پیتل کا نیا کشکول خرید لیا۔ تاہم مسلسل علاج سے اس کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ جس روز اس کا انتقال ہوا اس کے بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ طویل عرصہ کے بعد تین روز پہلے اس کے پاس چلا گیا تھا۔ شاید اسے موت کا علم ہو گیا تھا۔

کئی سال پہلے جہاں گلاب سے بھرے ہوئے باغ میں گول چھت والی عمارت تھی، وہاں اب ہریالی کا نام نہیں ایک بھی گلاب کا پھول نہیں۔ نہر کنارے جہاں گھاس پھوس کی جھونپڑیاں تھیں وہاں ٹیکسی سٹینڈ بن گیا ہے اور جہاں سیڑھیاں اوپر گول چھت پر جاتی تھیں وہاں پٹرول پمپ کی عمارت ہے۔ انہی سیڑھیوں میں ایک دفعہ میں حیدر کو ٹالسٹائی کے ناول کا ایک حصہ پڑھ سنا رہا تھا تو ساغر کی ڈوروں والی آنکھوں میں اشتیاق انگیز افسردگی سمٹ آئی تھی اور اس نے میرے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

مجھے پھر پڑھ کر سناؤ۔

اور میں نے پڑھا تھا۔

جس طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا تھا وہ اسی طرح مجھے سُولی پر چڑھاتے

ہیں، مجھے جکڑ کر عدالتوں میں لے جاتے ہیں، ایک بار انھوں نے مجھے پاگل خانے پہنچا دیا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے، کیوں کہ میں آزاد ہوں، وہ کہتے ہیں تمہارا نام کیا ہے؟ وہ سمجھتے ہیں میں اپنے آپ کو کسی نام سے پکاروں گا، مگر وہ خود کو کسی نام سے موسوم نہیں کرتا۔ میں سب کچھ ترک کر چکا ہوں۔ میرا کوئی نام نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں، کوئی وطن نہیں، کوئی کچھ نہیں۔ بس صرف میں ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟ میں جواب دیتا ہوں۔ انسان! تمہاری عمر کیا ہے؟ میں کہتا ہوں پتا نہیں، میں برسوں کو شمار نہیں کر سکتا؛ میں ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہوں گا۔ تمہارے ماں باپ کون ہیں؟ خدا کے سوا میرا کوئی نہیں، زمین میری ماں ہے۔

اعجاز رضوی : ہفت روزہ نصرت ۸/۷۴ ۱

عظمتِ ساغر

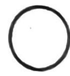
اپنے سینے سے لگائے رنج و غم کی داستاں
کالی چادر میں چھپائے اپنی عظمت کا نشاں



وہ سدا جلتا رہا ہے بے حسی کی دھوپ میں
سطوتِ فقر و رضا تھی اس کے چہرے سے عیاں



اس کے دم سے تھا میسّر بزمِ ہستی کو شعور
اس نے بخشا ہے سدا اجڑے ہوئے چہروں کو نُور



پھول اس کی شان تھے اور خار تھے اس کا وقار
اس کے قدموں پر ہمیشہ سر بسجدہ تھی بہار



چاند تارے اس کی عظمت پر کیا کرتے تھے ناز
اس کو حاصل تھا فقط تشریحِ انسانی کا راز





زینتِ مے خانہ تھا وہ رونقِ ویرانہ تھا
گلشنِ ہستی میں ساغر صبر کا پیمانہ تھا



شوخیٔ قدّ نگاراں اس کی صہبا کا وجود
مستیٔ چشمِ غزالاں اس کو کرتی تھی سجود



وہ تخیّل کا مجدّد وہ تصوّر کا امام
گردشِ دوراں بھی جھک کر اسکو کرتی تھی سلام



درد میں ڈوبا ہوا اک نغمۂ مضراب تھا
وہ زمانے کے ستم کا اک سنہری باب تھا



اس کا سینہ دوستوں کے درد سے معمور تھا
وہ فقط انسانیت کے نام پر مجبور تھا



اس کے سینے میں خلوص و فکر کا اک درد تھا
وہ بھی آخر اس زمانے کا مکمل فرد تھا





وہ فقیروں کی انا اور صاحبِ عرفان تھا
وہ ادب کا کارواں تھا وہ ادب کی جان تھا



وہ وفاؤں کا پجاری وہ محبت کا امیں
کوئی اس جیسا مجھے یارو نظر آتا نہیں



اس کے بن داتاؔ نگر کی بستیاں ویران ہیں
اس کے غم میں آئینے یادوں کے سب حیران ہیں



پھر زمانے کو اسی کی جستجو ہونے لگی
سسکیاں بھر بھر کے جب لوحِ جنوں رونے لگی



کن اندھیروں میں وقارِ آدمیت کھو گیا
جانے ساغرؔ کونسی بستی میں جا کر سو گیا



ظہیر احمد ظہیرؔ

***ستاروں کے سوا

ساغر صدیقی مرگیا۔ یہ ان لوگوں کا کہنا ہے جو ساغر کو گوشت پوست کا زندہ انسان تصور کرتے تھے اور جن کے نزدیک زندگی سانسوں کی آمدورفت کے تسلسل کا نام ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ساغر صدیقی کے ضمن میں موت برسوں پہلے اپنا فریضہ ادا کر چکی تھی اور اب صرف اس کی نعش کی تدفین ہوئی ہے جو ایک طویل عرصہ سے بے گور و کفن پڑی تھی ساغر



کا شمار بھی ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو موت کے دوہرے عمل سے گذرتے ہیں۔ ایک اس وقت جب وہ مرجاتے ہیں اور ایک اس وقت جب وہ دفن ہوتے ہیں۔ مرنے سے لے کر دفن ہونے تک بظاہر یہ لوگ زندہ رہتے ہیں لیکن ایک جیتی جاگتی لاش کی

صورت، لاشوں کے جنازے نہیں اٹھتے، نہ کوئی آنکھ اشکبار ہوتی ہے۔ نہ دوستوں کے شانوں کا سہارا ملتا ہے نہ انہیں کسی قبرستان میں جگہ ملتی ہے۔ پھر نہ ان کا کوئی گھر ہوتا ہے جہاں جا کر انہیں آواز دی جا سکے نہ کوئی مرقد جہاں چراغ جلایا جا سکے نہ ہی انہیں کسی نام سے پکارا جا سکتا ہے کیونکہ نام صرف زندگی تک باقی رہتے ہیں اور جن کی زندگی ختم ہو جائے وہ قبر کے اندر رہیں یا باہر مارے مارے پھریں کوئی ان کو یاد نہیں کرتا۔ کسی کو مل بھی جائیں تو نہیں پہچانتا۔ معاشرے سے ان کا ہر رشتہ نازک ریشمی دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے لوگ جب تک زمین کی پہنائیوں میں ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائیں اس وقت تک انہیں اپنی نعش کو اپنے ہی کندھوں پر اٹھا کر چلنا پڑتا ہے اور اس لامتناہی سفر میں کوئی ان کا ہمسفر ہوتا ہے تو فقط "اکلاپا"۔

ساغر صدیقی نے اپنی نعش کو اٹھا کر چلنے کا سفر ۱۹۵۲ء میں شروع کیا تھا۔ اسی سال انارکلی کے ایک چوبارہ میں ایک اداس سی شام کو اس کی موت واقع ہوئی تھی یہ بن بلائی موت تھی جسے ساغر نے راہ جاتے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کر لیا اور شدید تشنگی اور گرسنگی کے عالم میں موت کا پیالہ فرشتۂ اجل کے ہاتھ سے لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ بڑے بوڑھوں کی کہاوت ہے کہ جو شخص غیر قدرتی طریقے سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے اس کی روح آسمانوں اور زمینوں کے درمیان معلق رہتی ہے اور بے چینی واضطراب کے عالم میں بھٹکا کرتی ہے۔

ساغر سے بھی اپنی زندگی کو زہر کا جام پلانے کا گناہ سرزد ہوا تھا۔ اس کی روح جسم سے جدا تو ہو گئی لیکن آسمانوں تک نہ پہنچ سکی۔ زمین سے اس کا نام کٹ گیا لیکن آسمانوں پر درج نہ ہو سکا۔ ایسی روحیں اپنے جسد کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں اور مردہ خراب ہوتا ہے۔ ساغر صدیقی کا مردہ بھی خراب ہوا اور اپنی ہی زندگی کے خلاف ساغر صدیقی کی محلاتی سازش ناکام ہو گئی۔ عجلت میں پانسہ غلط پڑا اور وہ جو مرنا چاہتا تھا مر کر بھی زندہ رہا لیکن اس حالت میں زندگی اور موت دونوں اس سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ بیسویں صدی کے اس گمنام شاعر کو اپنے معصوم گناہ کی سزا یہ ملی کہ اپنی بے گور دکفن نعش کو ٹھکانے لگانے کا فریضہ بھی اسی کے سپرد ہوا۔ یہ اپنی قسم کا ایک بے مثال جنازہ تھا جس کی منزل کوئی قبرستان نہیں تھا۔ ساغر صدیقی

اپنے نے وطن میں پردیسی ہو کر رہ جانے والے شخص کی طرح اپنی مردہ زندگی کا بوجھ اٹھائے ڈیروں، تکیوں اور آستانوں میں بھٹکنے لگا کہ کسی موزوں سی جگہ کو پاکر اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اپنی جستجو میں تھک کر وہ کبھی کبھار اپنی نعش سیاہ چادر میں لپیٹ کر فٹ پاتھ پہ رکھ دیتا اور خود اس کے سرہانے بیٹھ کر سر گھٹنوں میں دے لیتا۔ مصروفیت کی تلاش میں پھرنے والے فارغ البال لوگوں کی توجہ اس کی جانب مرکوز ہو جاتی اور وہ گھنٹوں کھڑے اسے تکتے رہتے اور اس عارضی قبر پر نصب اس کتبے کے معنی و مفہوم کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں

آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

پھولوں کے خریداروں کو تو خیر چنگاریوں، شراروں اور انگاروں سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں لیکن نئی حیات کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے بھی اسے دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکتے کہ ساغر صدیقی نے جلا کر بھسم کر دینے کی قوت رکھنے والے شراروں کو سرد راکھ کے ڈھیر میں کیوں تبدیل کر دیا اور اب اس ڈھیر میں انگلیاں پھیر کر بے خیالی میں کس کی تصویر کے نقوش اجاگر کرنا چاہتا ہے؟ وہ اس راکھ کو ہوا کے تند و تیز جھونکوں کے سپرد کیوں نہیں کر دیتا؟ اس نیستی میں وہ کس ہستی کو باقی رکھنا چاہتا ہے؟ وہ اگر مرنا چاہتا تھا تو زندہ کیوں رہا اور اگر زندگی سے پیار تھا تو ادھوری موت کیوں مرا؟ ان سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ساغر صدیقی نے جو واردات کی اس کی شہادت دینے والا کوئی نہ تھا۔ اسے زندگی کے میلے سے فرار ہوتے بھی کسی نے نہ دیکھا تھا پھر جس کا سراغ ہی نہ ملے وہ سازش کیوں کر بے نقاب ہو؟ کڑیاں ملانے والے خفیہ ہاتھوں کا پتا کیسے چلے۔ اس خون کا قصاص کس سے طلب کیا جائے۔ خود مقتول ہی جس کا قاتل ہو؟ آخر کار بڑی دیر کے بعد انسانی ہمدردی کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں نے انتہائی سوچ بچار کے نتیجہ میں جو آراء مرتب کیں وہ کچھ یوں تھیں۔

"ساغر صدیقی جو بلاشبہ ایک عظیم شاعر اور سچا فنکار تھا کم ظرف ہونے کی وجہ سے اپنی ذات کی آگہی اور بے حقیقت دنیا کے اسرار کے ادراک کے بوجھ کو سہار نہ سکا اور بہادروں کی طرح تقدیر کے وار سینے، تدبیر کی شمشیر سے مقابلہ کرنے اور شہادت کے منصب پہ فائز ہونے

کی بجائے بزدلوں کی طرح موت کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش میں خودکشی کر بیٹھا۔"

ساغر صدیقی اگر مرنہ چکا ہوتا اور ہوش و حواس کی دنیا میں زندہ ہوتا تو وہ ذاتی مسرتوں کے حصول کی بیکار جد و جہد کو حیات آور بنانے اور بالواسطہ یا بلاواسطہ خودغرضی کی راہ پر چل کر کامیابی کا زینہ طے کرنے والے بہادروں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا کہ وہ بزدلی کی موت نہیں مرا بلکہ چھینا جھپٹی کرو دریا خودغرضی اور نفس پرستی کی دست بدست جنگ میں قتل ہوا ہے وہ خود نہیں مرا بلکہ مفلسی، تنگدستی، بے قدری اور تنہائی کے ہاتھوں ہلاک ہوا ہے یقین نہیں آتا تو ان فلم سازوں سے پوچھو جنہوں نے گیت لکھوائے اور معاوضہ نہیں دیا۔ اخبارات، رسائل اور جرائد کے ان مدیروں سے پوچھو! جنہوں نے نظمیں لکھوائیں لیکن فن کا خراج نہیں دیا۔ ان مالکان سے پوچھو جنہوں نے ملازم رکھا اور تنخواہ نہیں دی، ان دوستوں سے پوچھو جنہوں نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور بے سہارا چھوڑ گئے، ان نظموں غزلوں اور گیتوں کو پوچھو، جن میں مایوسی کا نہیں امید کا پیغام ہے کہ میں زندگی کے حقائق سے خوفزدہ نہیں تھا۔ میں اندھیروں میں پوشیدہ راہزنوں سے بے خبر نہیں تھا، دکھ تکلیف خوشی اور شادمانی کے مفہوم سے ناآشنا نہیں تھا۔ میں نے انبالے سے امرتسر اور امرتسر سے لاہور کا سفر اپنی زندگی ختم کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ میں نے باپ کی بے حساب کمائی پر اس لیے لات نہیں ماری تھی کہ مجھے زندگی کی ضرریات کی حاجت نہیں تھی۔ میں نے امرتسر کے بازار میں لکڑی کی کنگھیاں اس لیے نہیں تراشی تھیں کہ مجھے اُس وقت بالوں میں دھول ڈال کر ہاتھوں میں کشکول لے کر بھیک مانگنے کا فن نہیں آتا تھا۔ سوٹ بوٹ اور نکٹائی کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کرنے کی مشق میں نے بھی برسوں کی، خوبصورت باتیں، بلند بانگ دعوے اور دلچسپ تبصرے میں نے بھی دوستوں کی محفلوں میں کیے۔ آہنی عزم، اٹل فیصلے اور طویل پروگرام میں نے بھی بنائے لیکن یہ سب خاک میں مل گئے۔ اُس معاشرے میں جہاں انسانوں کا استحصال ہوتا ہو، جہاں غموں کے لٹیرے خوشیوں کے تعاقب میں پھرا کریں۔ جہاں ہر کوئی اپنی ذات کا معاملہ خود ہو۔ جہاں نام ساغر ہو لیکن مے صرف ان لوگوں کو ملے جو گھات میں رہتے ہیں اور پہلے ہاتھ بڑھا کر جام اٹھا لیتے ہیں وہاں زندگی کا راز طاقت میں ہے، طاقت حاصل کرنے کا راز تدبیر

میں ہے اور وہ ذہن جو نیچا دکھانے، سبقت لے جانے، کہیں جھک جانے کہیں جھکا لینے کی تدبیریں سوچتا ہے، وہ ہوش و حواس جو دوسروں پر کڑی نگاہ رکھنے کے کام آتے ہیں ان سے وہ بدحواسی بے ہوشی، مدہوشی اچھی ہے جو بے گانہ و بے نیاز کر دیتی ہے۔ اگر اپنی ذات میں گم ہو کر اپنے غم کا مداوا کرنا ہے تو پھر دنیا اور دنیا والوں سے تعلقات کا ناٹک کیوں؟ اگر ہاتھ پھیلا کر ہی مانگنا ہے تو سفید کلف لگے کپڑوں اور مصنوعی مسکراہٹ کا تکلف کیسا؟ کشکول اٹھانے میں کیا قباحت؟ لیکن یہ سب کچھ کہنے کے لیے ساغرؔ زندہ نہیں رہا۔ اس کہنے اور نہ کہنے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پانے کے لیے ہی تو اس نے بھنگ، چرس اور مارفیا سے دوستی گانٹھی تھی۔ ہوش و حواس سے بیگانگی اختیار کی تھی۔ اس کا دنیا میں تھا ہی کون جس کے لیے وہ کامیاب زندگی بسر کرتا؟ نہ کسی بہن کے ہاتھ پیلے کرنے تھے نہ کسی بوڑھی ماں اور لاچار باپ کی روٹی کا بندوبست کرنا تھا، نہ شریکِ حیات کی محبت کے تقاضے پورے کرنے تھے نہ اولاد کی محبت کو آسودگی دینا تھی۔

کوئی اس سے پوچھتا۔

"تم کون ہو"؟

"انسان"

"تمہارا نام کیا ہے"؟

"میں صرف میں ہوں"۔

"تمہاری عمر کتنی ہے"؟

"برسوں کا شمار لایعنی عمل"

"ماں باپ کہاں ہیں"؟

"ماں دھرتی اور باپ آسمان"۔

"کہاں جاتے ہو"؟

"جہاں خدا لے جائے"۔

ساغرؔ صدیقی کو زندگی سے فرار، بزدلی اور مجہولی کے طعنے دیے جا سکتے ہیں لیکن اس نے اس کا جواب بہت پہلے دے دیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا ؎

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں
ہر شناور پا نہیں سکتا تلاطم کا خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں

چنانچہ ساغر نے اگر اپنے سفینۂ حیات کا محافظ ناخدا کو نہیں بنایا اور اسے کف اُڑاتی بے منزل لہروں کے سپرد کیا تو الزام کیسا؟ سالوں زندگی کے بحرِ بیکراں میں ہچکولے کھانے کے بعد آخر کار طوفانی لہروں نے اسے اپنی گود میں پناہ دے دی ہے۔ ساغر اس دھرتی کے سینہ میں جذب ہو گیا ہے جسے وہ ماں کہتا تھا۔ اس قرض کا حساب ہو گیا ہے جو ۱۹۵۲ء سے اس پر واجب الادا تھا۔ جس فنکار نے غیر قدرتی موت کو گلے لگا لیا تھا اس کی نعش بالآخر قدرتی طریقے سے دوسرے لاوارث مُردوں کے ہمراہ دفن کر دی گئی ہے ــــــ ان ضمیر بیدار لوگوں کے لیے، جن کے لیے ساغر صدیقی کا زندگی کی حسیات سے عاری وجود ایک کچو کا تھا، اس نعش کی تدفین طمانیت بخش ہو گی کہ خون کے وہ چھینٹے جن کے بہانے میں ان کا دخل نہ تھا، لیکن جو انہیں اپنے خنجرِ آستیں سے ٹپکے ہوئے لہو کے قطرے محسوس ہوتے تھے، بے نشان ہو گئے ہیں۔ ساغر صدیقی "مکمل طور پر" مر گیا ہے۔ اب وہ کسی شناسا سے چونی، اٹھنی مانگنے نہیں آئے گا۔ نہ اس کی کالی چادر کسی کو دکھائی دے گی لیکن اس کی آواز کی بازگشت معدوم نہ ہو سکے گی ؎

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

ــــــــــــــ سعید صفدر

ایتھے اک قلندر آیا   جنھے ڈاہڈا رنگ وکھایا
لوکاں نیں ناں بھلا پایا   اوہدے کول سی فن سوایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

گل وچ کالے کپڑے پا کے   سینے دے وچ سُل چھپا کے
سِر وچ مٹی گھٹا پا کے   مڈھوں مُولوں بھیس وٹایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

اپنے آپ نوں پاگل کہہ کے   سب دیاں اُچیاں نیویاں سہہ کے
سُدیاں راہواں دے وچ بہہ کے   ڈاہڈا اپنا حال ونجایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

واہ واہ کھادے دھکے دھوڑے   تھاں تھاں وجے اِٹاں روڑے
اپنیاں غیراں نے منہ موڑے   ہر کھاں نے سی مینہ ورھایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

اکھ دے ٹانڈے بھجے سارے   گدڑاں بگھیاڑاں منہ مارے
ویکھ کے ایس دُنیا دے کارے   دل سی زخماں نال سجایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

سب کجھ ویکھیا چا کھیا اوہنے کسے نوں کجھ نہ آکھیا اوہنے
اپنے آپ نوں لا کھیا اوہنے کسے دا مُول نہ کجھ گوایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

آپے رویا آپے ہسّیا کسے نوں اپنا حال نہ دسّیا
اپنی دنیا دے وچ وسّیا کسے نہ اوہدا درد ونڈایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

رنگ محل وچ پھیرا پاکے لوہاری وچ ڈیرا لاکے
تھاں تھاں شعر دے بھانبڑ لاکے جاذب اوہنے من پرچایا
اک شاعر نے وقت لنگھایا

جاذب بخاری ایم اے ـــــ ۲۹/۷/۸۴



اعترافِ جُرم

یہ فروری ۱۹۵۲ء کی ایک دوپہر کا ذکر ہے جب میں نے اسے پہلی بار ہفت روزہ "معلومات" کے دفتر میں دیکھا۔ میں ان دنوں اپرنٹس ڈسپنسر تھا۔ ہفت روزہ معلومات کے ایڈیٹر صوفی محمد نواز تھے وہ میز پر جھکا۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر کچھ لکھ رہا تھا۔ لکھنے کے دوران وہ کبھی کبھی دفتر کی کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی دھوپ اور خلاؤں کو دیکھتا اور ریڈ لیمپ کے سگریٹ

کے لمبے لمبے کش بھر کر پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ مجھے ہفت روزہ معلومات کے ایڈیٹر کے لڑکے سجاد حیدر نے جو کہ ان دنوں میرے ساتھ ڈسپنسر کلاس ہی میں ایڈمٹ تھا بتایا کہ یہ ملک کا معروف شاعر ساغر صدیقی ہے۔ کھدر کا بند گلے کا میلا کچیلا کرتہ شلوار، اور کورے لٹھے کی چادر پاؤں میں چپل۔ یہ اس وقت میز پر جھکے ہوئے شاعر — ملک کے معروف شاعر کا لباس تھا سانولی رنگت، کشادہ پیشانی، میانہ قد، بڑی بڑی آنکھیں، بڑھی ہوئی شیو۔ سجاد حیدر نے آگے بڑھتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔ ساغر صدیقی نے مجھے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں ٹکٹکی باندھے کبھی اس معروف شاعر اور کبھی ریڈ لیمپ کی ڈبی کو دیکھتا رہا۔ اچانک ساغر نے میری طرف دیکھا اور سگریٹ پیش کیا۔

میں ان دنوں سگریٹ بالکل نہ پیتا تھا۔ معذرت کا اظہار کیا۔

کیا کرتے ہو — پڑھتے ہو؟

"سجاد حیدر نے ابھی ابھی آپ کو بتایا ہے کہ ہم ڈسپنسر کا کورس کر رہے ہیں" - میں جواب میں بولا۔

یوں کیوں نہیں کہتے — بنی نوع انسان کی خدمت کے لبادے میں "شریف ڈاکو" بننے کا کورس کر رہے ہو اور پھر ایک لمبا چوڑا لیکچر ڈاکٹروں اور ڈسپنسروں پر دے ڈالا کہ کس طرح بعض ظالم ڈاکٹر مجبور و مفلس مریض سے دو چار آنے کی معمولی معمولی دوائی کے دو چار روپے وصول کرتے ہیں اور ڈاکٹر کی اس کھلی لوٹ میں ڈسپنسر صرف چند سکوں کا حقدار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ اس لوٹ میں برابر کا ساتھ دیتا ہے لیکن برابر کا حصہ دار نہیں بنتا۔

میں پہلی ہی ملاقات میں ساغر صدیقی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا، دراصل وہ بیباک گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ سجاد حیدر کے گھر برابر روز آنا جانا تھا۔ وہیں گاہے گاہے ساغر صدیقی سے ملاقات ہوتی رہتی اور وقت کے ساتھ ساتھ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔

اس دوستی کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر وقت خود پر مدہوشی طاری رکھنا فرض سمجھتا ہے۔ اس فرض کو وہ زندگی کی آخری سانس تک پورا کرتا رہا۔ میں یہ آج تک سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ اس نے ہر وقت مدہوش رہنا کیوں پسند کیا تھا۔

میں نے ایک بار بھرپور کوشش بھی کی کہ وہ اس مدہوشی سے نکل آئے۔ میری اس ناکام کوشش میں صرف افضال صدیقی ایڈووکیٹ اور سید اعجاز حسین رضوی نے ساتھ دیا۔ باقی تمام ساغر صدیقی سمیت میرے دشمن بن گئے۔ جیسے میں ساغر صدیقی کے ساتھ ظلم کر رہا ہوں۔

مجھے سب سے زیادہ رنج ان لوگوں پر ہے جو اپنی سستی شہرت کی خاطر ساغر سے اپنے نام کی غزلیں نظمیں لکھواتے اور مشاعروں میں گا گا کر داد حاصل کرتے ہوئے خود کو ایک عظیم شاعر سمجھنے لگ جاتے اور پھر خدمت کے طور پر اسے مدہوشی کے لوازمات مہیا کرتے تھے۔ اسی خوشی میں ساغر دو چار غزلیں اور لکھوا دیتا۔ لاہور میں ایسے شاعروں کی تعداد انگلیوں پر نہیں گنی جا سکتی۔ راولپنڈی، ملتان، اوکاڑہ، ساہیوال تک کے لوگ دن کے اجالے اور رات کی تاریکی میں اس سے غزلیں لکھوا کر قد آور شاعر بنتے نظر آنے لگے۔ آج ساغر اکیلا نہیں مرا۔ میرے نزدیک ایک ہزار شاعر مر گیا ہے۔ ان کے دیوان و مجموعۂ کلام ادھورے رہ گئے ہیں۔ میں کئی بار ساغر سے الجھ جاتا کہ تم کیوں دوسروں کو شعر لکھ کر دیتے ہو، تو وہ میری اس بات کے جواب میں صرف یہی کہتا۔ "پہلی بات تو یہ کہ یہ شاعر ہو ہی نہیں سکتے۔ شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے میرا بیس پچیس روپے روز کا خرچہ ہے۔ وہ بھی تو پورا کرنا ہے"۔

اکثر ایسا ہوتا کہ میں اور ساغر صدیقی بازار میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور ساغر صدیقی کسی شناسا چہرے کو دیکھ کر رک گیا اور ایک چونّی کا سوال کر دیا۔ میں غصّے سے تلملا کر رہ جاتا کہ اگر چونّی ہی مانگنی تھی تو مجھ سے لے لیتے۔ میری جھنجلاہٹ کو بھانپتے ہوئے ساغر اپنے مخصوص انداز میں کہتا "بابا فقیر نے اس سے اپنا قرض واپس مانگا ہے۔ تم کیوں خفا ہوتے ہو"۔

شام ہوتے ہی وہ اپنے بیدار شعور کو مدہوش کیے واپس اخبار مارکیٹ لوٹتا۔ یہاں مرحوم خواجہ جاوید۔ میاں امتیاز، احمد نثار کاشمیری، قدیر شیدائی کے علاوہ یونس ادیب۔ حفیظ قندھاری الام لدھیانوی، حنیف صابری، ساجد انبالوی، طالب چشتی جیسے حلقۂ احباب کی محفل جمتی۔ رات گئے تک شعر و شاعری کا دور چلتا اور پھر رات گئے تک ہم بوجھل قدموں سے گھر لوٹتے۔ کبھی کبھی اس محفل میں اعجاز رضوی بھی شامل ہوتا۔ ہم لوگ گھر پہنچ کر جھاڑ پھٹکار کی لذت سے آشنا ہوتے۔ لیکن ساغر کی چند گھنٹوں کی صحبت گھر والوں کی جھاڑ پھٹکار پر ہمیشہ بھاری رہتی۔

غالباً ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے ایک دن طالب چشتی نے مجھے بتایا کہ آج چار روز ہوئے ساغر صدیقی کو رام گلی والے مارفیئے کے اڈے سے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور پولیس نے ضمانت نہ دینے پر عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا ہے۔ میں ساغر کی گرفتاری کا سن کر بھاگم بھاگ اردو پریس سروس میں اعجاز رضوی کے پاس پہنچا۔ وہ ان دنوں یو پی ایس کے نمائندے کی حیثیت سے اسمبلی کی رپورٹنگ کرتا تھا۔ میں نے اسے ساغر کی گرفتاری کا بتایا تو غریب اعجاز رضوی بھی کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ مالی اعتبار سے اعجاز رضوی کی پوزیشن اچھی تھی، باقی ہم سب "لڑکے" گھر والوں کی روٹیوں کے محتاج تھے۔ مجھے اعجاز نے کچھ پیسے دیے کہ ان سے ساغر کو پیشی کے روز سگریٹ وغیرہ خرید دینا۔ ہم دونوں نے پروگرام بنایا کہ دو تین دن تک ساغر کی گرفتاری اور پیشی کو اخباروں میں خوب اچھالا جائے اور پیشی کے روز افضال صدیقی ایڈووکیٹ کی معرفت ایک درخواست عدالت کو پیش کی جائے جس کا حاصل مضمون کچھ اس طرح ہو کہ میں عرصہ پانچ سال سے مارفیا اور بارہ سال سے چرس کا عادی ہوں۔ میں اس بری لعنت سے نجات چاہتا ہوں۔ لہٰذا بغرض علاج مجھے جیل کی بجائے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔

مقامی اخباروں میں ساغر صدیقی کی گرفتاری اور پیشی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں پیشی کے روز عدالت پہنچ گیا، لیکن وہاں پہنچ کر میں حیران رہ گیا۔ ساغر کے بے شمار مداحوں، عقیدتمندوں دوستوں میں سے صرف طالب چشتی ہاتھ میں قینچی کے سگریٹ کی دو ڈبیاں لیے اپنے اسیر دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر طالب چشتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ طالب چشتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں انگاروں پر لوٹ کر رہ گیا۔ میں نے اسے سینے سے لگایا، پیار دحوصلہ دیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

غریب مفلس لیکن حد درجہ مخلص طالب چشتی نے قینچی کے سگریٹ کی دونوں ڈبیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بھائی یہ کسی طرح ساغر کو کچہری کی حوالات میں پہنچا دو۔ ساغر کے پاس سگریٹ نہیں —؟

میں پو پھٹتے ہی ضلع کچہری پہنچ گیا ہوں، مجھے جس دن سے ساغر گرفتار ہوئے خدا کی قسم کسی کروٹ چین نہیں، یہ کہتے ہوئے طالب چشتی روتے ہوئے ہچکیاں لینے لگا۔ میں نے اسے

دوبارہ گلے لگایا اور خود بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ ابھی ہم دونوں اپنی پرنم آنکھوں سے ساغر کی گرفتاری کا ماتم کر رہے تھے کہ ساغر صدیقی گداگروں کی ٹولی میں ایک ہاتھ کو ہتھکڑی لگائے سر جھکائے پیشی کے لیے عدالت کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے ساغر کو دیکھتے ہی اسی کے مخصوص انداز میں آواز دی "مولانا"!

طالب چشتی دوڑا دوڑا ساغر کی طرف بڑھا اور سگریٹ کے دونوں پیکٹ ساغر کو تھما دیے۔ اسیر گداگروں کی ٹولی کے محافظ سپاہی نے طالب کو ڈانٹ کر پیچھے ہٹنے کو کہا۔ میں ساغر کے ساتھ ساتھ قدم ملائے عدالت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جیل کے ماحول پر بھرپور تبصرہ کر رہا تھا کہ جیل میں بھی جرائم ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے جرم کرنے والوں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ جیل میں بھی چرس کھلے عام فروخت ہوتی ہے۔ قمار باز جوا کھیلتے ہیں لیکن جرائم پیشہ لوگوں کی آباد اس دنیا میں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔

جو زیادہ عادی مجرم ہے وہی جیل میں عزت دار ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس جہنم سے نکالو مجھے جوئیں چڑھ گئی ہیں۔ جیل میں شعر و ادب کی زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ ہر وقت گالی گلوچ، مار پیٹ ان لوگوں کا وطیرہ ہے۔ جیل کی چار دیواری میں مجھ ایسے لاوارث و مفلس، جانور سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قاتل، چور، ڈاکو، جیب کترے، جواری، جیل کی چار دیواری میں ڈنڈ پیلتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ساغر ایک ہی سانس میں سب کچھ اگل دینا چاہتا تھا کہ طالب جلدی سے ضمانت و مچلکہ کے کاغذات لے آیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ کسی منشی سے پُر کرا لو۔

ساغر نے میری اور طالب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، خود ہی پُر کر لو۔ ایسے فارم پُر کرانے کے پیسے لگیں گے۔ ہمایوں ضمانت تم ہی دینا ــ ہاں میرے لال۔

بہتر مولانا ــ کہہ کر میں طالب کو ساتھ لیے ایک طرف چل دیا اور ساغر عدالت کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے پیشتر سر جھکائے مرجھائے ساغر کے جسم میں عجیب حرارت پیدا ہو گئی اور وہ خود ہی مسکراتا عدالت کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

میں نے علیحدگی میں طالب چشتی کو چکمہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ ضمانت تو جائیداد و

مکان کی رجسٹری کے بغیر ہوگی نہیں۔ تم جلدی سے کسی مکان کی رجسٹری کے مالک کو ضمانت دینے پر آمادہ کر کے لے آؤ۔ میں یہیں عدالت میں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ میرے منہ سے یہ الفاظ سُن کر وہ بھونچکا سا رہ گیا اور پھر میرے سمجھانے بجھانے پر ضمانتی لانے چل دیا۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد یکدم دوبارہ واپس لوٹ آیا اور آتے ہی کہا ــ بھائی اپنی ضمانت لکھوا دو وگرنہ ساغر جیل میں مر جائے گا۔ میرے پاس تین روپے ہیں۔ کچھ آپ نکالیں دس روپے کسی کو دے دیتے ہیں۔ ضمانت ہو جائے گی۔ دس لینے کے بعد کون ہے جو رجسٹری پوچھے گا؟

ضمانت کروانے کا یہ فن اور نشیب و فراز تو میں خوب جانتا تھا۔ لیکن مجھ میں اس حوصلے کا فقدان تھا جو طالب کو یہ بتلائے کہ میری نیت ساغر کو ضمانت دے کر رہائی دلانے کی نہیں، بلکہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نشے کی لت سے نجات دلانے کی ہے، میں نے طالب کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم کوشش تو کرو ــ اگر تمہیں ناکامی ہوئی تو پھر ایسا بھی کر لیا جائے گا۔ یقین جانو ــ آج ساغر جیل میں نہیں سوئے گا۔

میں ابھی کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے واپس لوٹتا ہوں، میرا انتظار نہ کرنا اگر دیر ہو گئی تو اپنی ضمانت پر ساغر کو ضرور رہائی دلا لینا۔

میں نے طالب کو تسلی دے کر کچہری سے رخصت کیا۔ خود عدالت کی طرف بڑھا۔ پاگل خانے والی درخواست پہلے سے تیار تھی۔ عدالت سے باہر افضال صدیقی ایڈووکیٹ میرا منتظر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ درخواست تو اردو میں لکھی ہے۔ ساغر پاگل خانے کی درخواست پر دستخط کر دے گا؟ مجھے تو ڈر لگتا ہے تم کسی طرح درخواست پر ساغر کے دستخط حاصل کر لو۔ وگرنہ ہم کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکتے۔

افضال بھائی انگریزی میں ٹائپ کروا لیتے ہیں۔ ساغر انگریزی زبان سے نابلد ہے۔ میں جواب میں بولا۔

میں اور افضال باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساغر اپنے شناساؤں اور تماشبینوں کے ہجوم میں گھرا بولا ــ لکھوا لی ضمانت؟

ہاں ہاں لکھوا لی ہے، فکر نہ کرو میں تسلی دیتے ہوئے بولا اور تیزی سے ضلع کچہری سے

باہر نکل آیا۔ میں نے کچھ پھل اور سگریٹ کی بیس پچیس ڈبیاں خریدیں اور واپس لوٹ آیا اور آتے ہی پھل کے دونوں لفافے اور سگریٹ ساغر کو دیے۔ ساغر نے بلا سوچے سمجھے تمام پھل اپنے ارد گرد تماشائیوں کے ہجوم میں تقسیم کر دیا اور مجھے فضول خرچی پر کوسنے لگا۔ مولانا کیا کر رہے ہو، فضول خرچی میں نے ابھی ضمانت پر رہا ہو جانا ہے۔ اتنی سگریٹ کی ڈبیاں کیا کرنی ہیں۔

میں نے لوہا گرم دیکھ کر درخواست آگے بڑھا دی اور جلدی سے قلم ساغر کے حوالے کیا کہ دستخط کر دو۔ ضمانت کی درخواست ہے۔ ساغر نے قلم ہاتھ میں لے کر درخواست کو پڑھنا شروع کیا۔ میں نے بھانڈا پھوٹنے کے اندیشے سے۔ فوراً جملہ چُست کیا۔ ہاں ہاں مولانا مجھے علم ہے تمہیں درخواست پڑھنی آتی ہے۔ دستخط کر دو خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔

پڑھ تو لینے دو۔

پڑھ کر کیا کرو گے۔ درخواست ہے کوئی اشٹام تو نہیں جو تمہاری جائیداد ہتھیا لوں گا۔

پڑھ لو تسلی ہو جائے میں نے قدرے غصے سے کہا، حالانکہ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

ساغر نے میرے منہ سے برہمی کا اظہار سُن کر درخواست پر بغیر پڑھے دستخط کر دیے اور میں نے جلدی سے درخواست افضال صدیقی ایڈووکیٹ کو تھما دی۔

میں نے ساغر کو چائے کا پوچھا؟

اسیری میں کھانے پینے کا کوئی مزہ نہیں ___ ابھی ضمانت کے بعد اکٹھے چل کر پئیں گے۔

ہمایوں تم حیران ہو گے کہ میں نے کوئی چار سو کے قریب اشعار جیل میں کہے ہیں۔ انہیں بھی کاغذ پر لکھنا ہے جیل میں منشی لوگوں سے قلم اور کاغذ لے کر میں نے کچھ لکھ لیے ہیں اور کچھ حافظے میں محفوظ ہیں۔ میں نے مذاقاً کہا میں تمہیں جیل میں ہر چیز پہنچا دیا کروں گا۔ کاغذ، قلم، سگریٹ صابن پھل، تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتا دو۔ باہر آ ؤ گے تو لوگ تم سے چند سکوں کے عوض تمہارے شعر اپنے نام سے چھپوا لیں گے۔ نشہ بھی کم ہو جائے گا ___ جیل میں رہو بہتر ہے۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ چائے آ گئی۔ چائے ابھی پیالیوں میں ڈالی ہی تھی کہ پیشی کے لیے آواز پڑ گئی۔ ہم سب لوگ چائے چھوڑ عدالت کی طرف بڑھے۔ اور ساغر بھی گداگروں کی ٹولی کے ہمراہ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا عدالت میں پیش ہوا ___ مجسٹریٹ کے روبرو درخواست پیش

کی گئی۔ مجسٹریٹ نے درخواست پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کرتے ہوئے کہا محمد اختر عرف ساغر صدیقی
۔عدالت تمہاری درخواست منظور کرتی ہے اور تمہیں جیل کی بجائے پاگل خانے بھیجنے کا حکم دیتی ہے۔

پاگل خانے؟ ساغر بڑبڑایا۔ لیکن جناب درخواست تو میں نے ضمانت کے لیے دی ہے۔
آپ مجھے پاگل خانے بھیج رہے ہیں۔ ساغر چیختے ہوئے بولا۔

یہ درخواست تمہاری ہی ہے نا۔ دستخط بھی۔ عدالت نے درخواست پاس بیٹھے ریڈر کی معرفت کٹہرے میں کھڑے ساغر کی طرف بڑھا دی۔ ساغر صدیقی نے درخواست کو پڑھنے کے بعد میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ سارا چکر اس جاہل کاشمیری کا چلایا ہے۔ خدا کی قسم اس نے دستخط ضمانت کا کہہ کر کروائے ہیں۔ میں غریب شاعر ہوں۔ لاوارث شاعر مجھے پاگل خانے مت بھیجیں، جیل بھیج دیں میں مر جاؤں گا۔ ساغر صدیقی نے کھچا کھچ بھری عدالت میں واویلا شروع کر دیا۔

ہمایوں کاشمیری کون ہے؟ مجسٹریٹ نے ساغر کے منہ سے سب کچھ سُن کر کہا۔

جناب ۔ میں ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھا۔ بھئی تم کیوں اسے پاگل خانے بھجوانا چاہتے ہو؟

جناب۔ ملزم نہ تو کوئی صاحب جائیداد ہے اور نہ ہی میرا دشمن ہے،
ساغر ایک شاعر ہے اور شاعر قوم و ملک کا سرمایہ و آواز ہیں اس کا بقول ساغر جاہل دوست ہوں، میری دلی آرزو ہے کہ یہ مارفیا و چرس کی عادت سے نجات پائے۔ اور اس کا صرف یہی ایک حل نظر آیا ہے کہ اسے پاگل خانے علاج کے لیے بھیج دیا جائے لیکن وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہیں، تم نے عدالت کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے جو کہ جرم ہے۔

جرم ۔ مجسٹریٹ کے منہ سے جرم کا سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ۔
افضال صدیقی نے عدالت کو بتایا کہ ہمایوں کاشمیری کی نیت کوئی بُری نہیں۔ اگر ساغر صدیقی ایسا کرنے پر آمادہ نہیں تو ہم اپنی درخواست واپس لے لیتے ہیں۔
کمرۂ عدالت سے باہر نکل کر ساغر صدیقی اور ہجوم نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے تمام گالیاں خموشی سے سنیں اور گھر چلا گیا۔ اس دن کے بعد ساغر اگر سرِ راہ مل گیا تو روپیہ آٹھ آنے دے دلا کر اپنی راہ لی۔ ساغر نے میری اس نیک نیتی کو آخری دم تک معاف نہیں کیا اور ہمیشہ مجھ سے یہی کہتا رہا وہ تو بھلا ہو اس مجسٹریٹ کا جس نے میری بات سُن لی وگرنہ تم نے مجھے پاگل خانے بجھوا دیا تھا۔

ہمایوں کاشمیری

عقیدت دے پھُل

سوچ وچار دی سُچی دولت ازلوں حصّے آئی
اوّل آخر ظاہر باطن رمز حقیقی پائی
غیرت انکھ ایمان مکمل عاشق مرد مولائی
رمز کنائیے تشبیہاں دی وکھری کھیڈ رچائی



صابر صبر صدق دا مالک درداں دا ونجارا
درد پرائے جھولی پا کے رویا درداں مارا
یاداں دے امبر تے روشن ہر دم روشن تارا
قدر ویلے دی خوب پچھاتی سچیاں قدراں والا
یار داناواں جپ دا رہیا پھیر کے دم دی مالا

طالب چشتی لاہور، ۲۶ ۹/۷۴

لیپٹ کر رو لوں

ساغرؔ صدیقی کی موت ایک شخص کی موت پورے سماج کا المیہ ہے جب تک وہ زندہ رہا اپنے میلے ناخنوں اور شفاف سوچوں سے فکر و اظہار کے جگنو ہوا میں اڑا تا رہا "غمِ بہار" "خشتِ میکدہ" تک اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ادب کا ناقابلِ فراموش اور غیر فانی سرمایہ ہے۔

سرمایہ داری اور نفسا نفسی کے اس دور میں انسان کی قیمت اس کا ذاتی کردار، اعمال اور نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ سکوں کی تعداد اور مقدار سے لگائی جاتی ہے۔ مشاعرہ میں جو شاعر تین سو روپے "زادِ سفر" وصول کرتا ہے، وہ بڑا شاعر ہے اور جسے ڈیڑھ سو روپے ملتے ہیں وہ چھوٹا شاعر ہے۔ قد کا معیار اور اندازہ جسم سے نہیں سائے سے لگایا جاتا ہے۔ جس کے پیچھے جتنی زیادہ دولت کی روشنی کا بلب ہوگا اس کا سایہ اتنا ہی دور جائے گا۔ لہٰذا وہ اتنا ہی بڑا فرد گردانا جائے گا۔

ساغرؔ صدیقی کی موت پر رونے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ بات اچانک اور غیر متوقع نہیں ہوئی، البتہ ان شاعروں سے ہمدردی کرنے کی اشد ضرورت ہے جو اب شاعر نہیں رہیں گے تو نیا شعر نہیں کہہ سکیں گے۔ ان ناشروں کے بھی دکھ بانٹنے کی ضرورت ہے جو ساغرؔ صدیقی سے اس کے مجموعۂ کلام کا معاوضہ پانچ سو طے کر کے اسے پچاس پر ختم کر دیں گے۔ ہو سکے تو ہر اس آدمی سے ہمدردی کرنی چاہیے جس کے دل میں آنسو آئے ہیں اور آنکھیں شہر میں اڑتی ہوئی مٹی سے اٹ جاتی ہیں۔

ساغرؔ صدیقی نے مجھے ایک بار کہا تھا کہ "مجھے اپنی موت کا کوئی خیال یا خدشہ نہیں۔ یہ سب وقت گزرنے کی باتیں ہیں۔ مرنا اور جینا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اس وقت میں نے یہ بات ایک مجذوب کے قول کے طور پر سُن لی تھی۔ اب یکدم یاد آ گئی ہے۔

اس نے اپنا یہ شعر مجھے اسی وقت ہی سنایا تھا۔

ہزاروں پھول کھلے اپنا قافلہ نہ رکا
دلوں میں داغ لیے ہم چمن سے گذرے ہیں

ایک بار اس نے میاں چنوں کے مشاعرہ میں اپنی غزل پڑھی تو اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ اس کی آواز اور لہجہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے منزل کے قریب صدائے جرس۔ جس قافلہ کا وہ فرد تھا وہ قافلہ بکھر چکا تھا۔ درختوں کی شاخوں کی تازگی، سڑکوں پر آوارگی اور خود سے بیگانگی نے اسے اگرچہ بہت کچھ دیا مگر ہم سے ایک بہت بڑا شاعر چھین لیا۔

تجھے یاد رکھیں گی ساغر بہاریں
ترے شعر میں گلزاروں کے جھرمٹ

ظفر جعفری

میرا ساغر

حافظ امرتسری

ساغر میرا، میرا ساغر ساغر تیرا، تیرا ساغر
کل تھا ساغر سب کا
آج نہیں وہ تیرا میرا آج ہے ساغر رب کا
درویشوں کا پیارا ساغر
سب کی آنکھ کا تارا ساغر
حلقۂ یاراں کا متوالا عظمتِ یاراں کا رکھوالا
یاروں کا گردیدہ ساغر یاروں میں سنجیدہ ساغر
اُردو غزل کی جان رہا ہے ہر محفل کی شان رہا ہے
ساغر بہتر، ساغر برتر
داتاؒ کی گلیوں کا زائر
ایک انوکھی چال کا مالک حال کا مالک قال کا مالک
نعتِ محمدؐ کہنے والا اپنی دُھن میں رہنے والا
دل سے خوگر حمد و ثنا کا پیکر تھا وہ صدق و صفا کا
ساغر تھا انسانِ مجسم
شعروں کا طوفانِ مجسم

عزت اس کو راس رہی — یہ دولت اسکے پاس رہی
حال میں گو بیحال تھا ساغر — پر گدڑی میں لعل تھا ساغر
جس ساغر کو لوگ نہ سمجھے — جس کے دل کا روگ نہ سمجھے

وہ ساغر جو یار تھا میرا

وہ ساغر جو یار تھا میرا

میں بھی اسکو ڈھونڈ رہا ہوں — تو بھی اسکو پوچھ رہا ہے
وہ ساغر آوارہ ساغر — گلیوں کا بنجارہ ساغر
بستی بستی گھومنے والا — ہر آفت کو چومنے والا

وہ ساغر جو خار رہا ہے

وہ ساغر بیمار رہا ہے

روٹھ گیا وہ کب کا
کل تھا ساغر تیرا میرا — آج ہے ساغر رَبّ کا

قرض ہے چار پھولوں کا

ساغر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی جب وہ اندرون شاہ عالمی گیٹ پری محل میں ساجد انبالوی کی بیٹھک میں رہا کرتا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے مسلسل ملتے رہے روزانہ رات کو شعر و سخن کی مختصر سی محفل لگتی ایک دوسرے کو اپنا اپنا تازہ کلام سناتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔ اس وقت ساغر سگریٹ کے سوا کسی اور نشے میں مبتلا نہ تھا۔ اس کے ہوش و حواس بالکل درست تھے۔ اس کی آواز میں بڑا سوز تھا وہ مشاعرے میں ترنم سے غزل پڑھتا تو مشاعرہ لوٹ لیتا۔ ہماری یہ مختصر بزم زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ایک دن ساغر ساجد انبالوی کی بیٹھک چھوڑ کر چلا گیا اور رائل پارک میں ہفت روزہ "محفل" کے دفتر میں ڈیرہ جما لیا۔

ساغر انبالہ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں بھوک اور بیماری کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر امرتسر چلا آیا اور پاکستان بننے کے بعد وہ لاہور چلا آیا اور لاہور کو مستقل طور پر اپنا وطن بنا لیا۔

ساغر نے ابتدا میں کئی پاکستانی فلموں میں گیت بھی لکھے جو کافی مقبول ہوئے اور آج بھی ہمارے کانوں میں ان گیتوں کے بول گونجتے ہیں۔ فلم ساز نے گیتوں کے معاوضے کے طور پر ان کو جو کچھ بھی دیا اس نے اسے خوشی سے قبول کر لیا۔ اگر کسی فلم ساز نے کچھ بھی نہ دیا تو ساغر نے اس سے کوئی مطالبہ نہ کیا لیکن ساغر کے اس اصول سے دوسرے فلمی شاعروں کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔ انہوں نے اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے ساغر کو چرس کے نشے کی طرف مائل کر دیا۔ اس نیک کام میں زیادہ تر ان شاعروں کا ہاتھ تھا جن کی آج بھی فلم انڈسٹری پہ اجارہ داری قائم ہے۔ جو ہر اچھے شاعر کو کسی نہ کسی طرح فلمی دنیا میں داخل ہونے سے اب بھی روک دیتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی نامور شاعر ہیں جنہوں نے ساغر

کو چرس پلا کر گیت لکھوالیا اور فلم میں اپنے نام سے دے دیا۔

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

ساغر کے دامن میں واقعی شرارے تھے۔ غربت اور مفلسی کے شرارے جنہیں وہ بجھانے کے لیے ساری زندگی جدوجہد کرتا رہا۔ لیکن یہ شرارے نہ بجھ سکے ان شراروں کی تپش سے بچنے کے لیے وہ اپنے آپ کو آہستہ آہستہ چرس اور مارفیا کے نشے میں ڈبوتا چلا گیا اور چنڈو خانوں کو اپنا مسکن بنا لیا لیکن وہ پھر بھی اس آگ سے محفوظ نہ رہ سکا اور ایک دن جل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا

ساغر اپنی زندگی میں کبھی کسی پر بار نہیں بنا اس نے کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا۔ اس نے کسی دوست کا دل نہیں دکھایا۔ اس نے اگر کسی ملنے یا جاننے والے سے سوال کیا تو اس کی حیثیت کے مطابق وہ خود کہا کرتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اپنے کسی دوست یا ملنے والے سے ضد کر کے بھی بہت کچھ حاصل کر سکتا ہوں لیکن کسی کو مجبور کرنا یا دل دکھانا میری زندگی کے اصولوں میں نہیں۔ خواہ وہ اچھے تھے یا برے وہ ہمیشہ ان پر عمل کرتا رہا۔

ساغر مرنے سے پانچ دن پہلے مجھے داتا دربار کے قریب ملا تھا اس روز وہ مجھے خلافِ توقع چائے پلانے کے لیے زبردستی ہوٹل میں لے گیا کیونکہ اس سے پہلے اس نے مجھے کبھی چائے نہیں پلائی تھی۔ وہ جب بھی مجھے ملتا تھا مجھ سے چائے پیتا۔ روٹی چائے کے لیے کہا کرتا تھا اور میں بخوشی اس کی یہ خواہش پوری کر دیا کرتا تھا اس دن وہ ہوٹل میں کافی دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا اور بھولی بسری باتوں کو یاد کر کے دہراتا رہا اور جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو اس نے مجھے اپنا ایک شعر سنایا۔

یاد رکھنا ہماری تربت کو
قرض ہے تم پہ چار پھولوں کا

ساغر نے یہ شعر پہلے بھی مجھے کئی دفعہ سنایا تھا اور اس شعر سے وابستہ اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ یہ شعر میں نے اپنے مرقد کے لیے کہا ہے۔ کون جانے کہ ساغر کا یہ شعر اس کے مرقد پہ لکھا بھی جائے گا کہ نہیں۔

محسن سہسوانی

ساغر صدیقی

طاہر لاہوری

وہ ساغر جو دیوانہ تھا

دل کا دامن چاک کیے جو دشتِ جنوں میں پھرتا تھا

ہستی کا اک پتھر توڑا

زیست کا سارا زہر نچوڑا

ہنگاموں کا طوفانوں کا دریا اس نے پار کیا

گہرے سناٹوں میں اس کی دھڑکن دھڑکن سازبنی

فریادوں کی اک صدا تھا

ہنستا تھا تو فرزانوں کی آنکھیں نیر بہاتی تھیں

وہ ساغر جو دیوانہ تھا

اس کا چہرہ جو کچھ بھی تھا چہرہ تھا

ایک حقیقت

ایک صداقت

اور نقابوں والے چہرے تکتے تھے اور ہنستے تھے

دیوانہ تھا یا فرزانہ

ایک صدا تو دیتا تھا

اس کی خاموشی ہنگامہ، اس کا ہنگامہ خاموشی
ویرانوں میں شہر تھا ساغرؔ شہر میں اک ویرانہ تھا
وہ ساغرؔ جو دیوانہ تھا
شعروں کی جاگیر میں ساغرؔ نہ تو کوئی وڈیرا تھا
نہ اس کے کشکول سے مظلوموں کی چیخیں اٹھتی تھیں
اپنی ذات کے اندر نہ وہ چھلکا اور نہ خالی تھا
لیکن وہ اک ساغرؔ تھا
شاید اک سقراط تھا ساغرؔ
زہر تو وہ پی لیتا تھا
آگ تو وہ پی لیتا تھا
لیکن ساغرؔ انسانوں کا خون کبھی نہ پیتا تھا
وہ ساغرؔ
وہ ساغرؔ جو دیوانہ تھا



سچ کا بیوپاری

درویش شاعر ساغر صدیقی آج کے دور کے جور و ستم کے ہاتھوں مارا گیا، جس میں ہمارا معاشرہ بددیانتی، کمینگی اور انسان دشمنی کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہے اور معاشرے کے ذہین تخلیق کاروں کو بے دردی سے قتل کر رہا ہے۔ ساغر صدیقی نے صبر و استقلال کے ساتھ اپنے عہد کی برائیوں کا مقابلہ کیا اور ایک سچے فنکار کی طرح ان لوگوں سے الگ رہا جو ہر جائز و ناجائز

طریقے سے دولت مند بننے کے لیے اخلاقی قدروں کو روند رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو مدہوشی کا عادی بنالیا تھا۔ میں کہتا ہوں ایک حساس فنکار اور کیا کر سکتا ہے۔ جب معاشرے میں عزتِ نفس محفوظ نہ رہی ہو اور لوگ سچائی کے لیے ترس گئے ہوں۔ ساغر جھوٹ کے بازار میں سچ کا بیوپاری تھا۔ اس کے پاس صرف سچائی تھی اور اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ آج کے دور میں پیدا ہوا، جہاں طمع، حرص اور خوف کے مارے ہوئے لوگ سچائی کی شناخت سے محروم ہیں۔ ساغر صدیقی ایک عظیم فنکار تھا اور اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس نے غم کے پتھر کھا کر بھی فن کے موتی دیے۔ میں ساغر صدیقی کی عظمتوں کو سلام کرتا ہوں۔ ساغر کی عظمتیں انسان کی عظمتیں ہیں اور ساغر صدیقی کے اشعار انسانیت کے نام سچائی کے پرستاروں کا ایک حسین پیغام ہیں۔

فلمسٹار عنایت حسین بھٹی

بہشتِ عذابِ آفریں کا مسافر

ساغرؔ صدیقی کی یاد میں

—— شوکت ہاشمی ——

مجھے کیا اگر وہ
کسی کے گناہوں کی پاداش میں
چیتھڑوں میں بٹا، بیکسی کا کفن اوڑھ کر
زندگی کے شکستہ و بوسیدہ تابوت کے رُوپ میں رُوح کا ہاتھ پکڑے ہوئے
اپنا گونگا بدن اوڑھ کر،
(دکھ بھرے رنج وغم سے پٹے راستوں پہ رواں)
فکرِ حاصلِ فراموش معدوم سی آرزو کا سہارا لیے جی رہا تھا۔
کہیں بانجھ بوڑھی، کہیں پہ کنواری جواں سال سڑکوں کی چھاتی سے چمٹا ہوا اپنا گندہ لہو پی رہا تھا
مجھے کیا وہ بھرے شہر میں
اپنے دل اپنی آنکھوں کے زخموں کا مرہم
بجھی بند گلیوں میں، گم صُم مزاروں میں، سُونی منڈیروں کے چُپ چُپ پرندوں میں، جا ڈھونڈتا تھا
اسے خبط تھا کہ فقط، الجھنوں اور پریشانیوں کا مداوا یہی ہے۔

مجھے کیا اگر دل بھرے شہر میں
چُپ کی بارش میں بھیگا ہوا، خشک بے روح ہونٹوں پہ کالی زبان پھیرنے
کا بھی مجرم نہیں تھا۔

کسی کے لہو میں لہو سرسرانا گناہ تو نہیں
نیک دل لڑکیو، آخری مرتبہ لائبریری کے مخروطی زینے پہ پڑھنے کا دن یاد رکھو
(کتابوں سے قطع تعلق) وہ چہروں وہ آنکھوں کے پڑھنے کا دن یاد رکھو
___ مگر شہر میں اُلّوؤں اور چمگادڑوں نے کیوں یلغار کی ہے۔

کہاں ہے وہ سورج
معلق تھا جو آنگنوں میں
___ مگر اب تو راتوں کی نیندیں اُچٹنے لگی ہیں،
وہ اک عام سا آدمی، پیلے دانتوں، سیاہ ناخنوں، موٹے ہونٹوں کا ___
کالی سی رنگت کا پیکر
وہ دامن دریدہ، تہی دست، وہ فاقہ کش بدبوؤں کا ہیولا
مجسمہ وہ دم توڑتی زندگی کا، وہ ڈھانچہ سا اک کھانستی ہانپتی زندگی کا۔
جیب میں جس کی صابن بلیڈ تیل چائے کے بسکٹ کے پیسے نہیں تھے۔
جو روٹی پہ لڑتے ہوئے کتّوں کی مکروہ آواز سے چونکتا بھی نہیں تھا
جو کبھی جو نہاتا نہیں تھا سنورتا نہیں تھا
جس کا بھدا شکم گالیوں، نفرتوں، ہتکوں سے بھی بھرتا نہیں تھا

وہی مرگیا ہے جو مرتا نہیں تھا

مگر کون ہوگا

جو روشن مکانوں، مہکتی ہوئی شاہراہوں، جواں سبز کھیتوں میں اب اس کا
ماتم کرے گا۔

دُھواں چھوڑتی، لمبی لمبی یہ کاریں یہ جیپیں، بسیں یونہی چلتی رہیں گی۔

کوئی اس کے لیے نہ تھما ہے، نہ کوئی تھمے گا۔

کہ ان جگمگاتی ہوئی شاہراہوں سے، روشن مکانوں، جواں سبز کھیتوں سے اس کا تو
کوئی بھی رشتہ نہیں تھا۔

داتا دربار کے گنگ مینار ہی اس کا نوحہ پڑھیں گے

—— کہ اب اپنی چندھیائی آنکھوں کو ملتا ہوا کون آئے گا

—— کہ وہ کون ہوگا جسے دیکھتے ہی منڈیروں پہ بیٹھے ہوئے یہ پرندے
نئی حمد گائیں گے۔

شہر در شہر بوڑھی جواں سال سڑکوں، بجھی بند گلیوں اور گم صم مزاروں پہ
اب اس کا بھی کوئی کتبہ لگے نہ لگے

وہ آزاد تھا اور زندہ تھا

آزاد ہے اور زندہ رہے گا

فقیر کی کمائی

وادیٔ کشمیر میں ایک نہایت ہی خوبصورت دہقان زادی تھی جس کے حُسن و جمال کے چرچے پوری نگری میں تھے۔ نام اس کا زون (چاند) تھا اور وہ ملکہ کا نصیبہ لے کر آئی تھی اور جب سلطان یوسف چک کی ملکہ بنی تو حبّہ خاتون کہلائی۔ وہ دوشیزہ محض ایک حسین و جمیل ہی نہ تھی بلکہ کشمیری زبان کی بہت بڑی شاعرہ بھی تھی اور راہبہ بھی! ملکہ اور شاعرہ سے وہ راہبہ کس طرح بنی؟ اس داستان سے وادی کا بچہ بچہ واقف ہے کیونکہ جب مغلِ اعظم اکبر نے کشمیر کو



زیرِ نگیں کر لیا اور سلطان یوسف چک کو پابندِ سلاسل کر کے جلا وطن کر دیا تو وہ باوفا بیوی اپنے محبوب شوہر کی یاد میں تڑپنے لگی۔ محلات کو چھوڑ دیا۔ دنیا کی رنگینیوں سے دل اچاٹ ہو گیا اور

جوگن بن کر ایک کٹیا میں باقی ماندہ زندگی گزار دی۔ وہ ایک عظیم شاعرہ تھی اور دل کی بات گیتوں اور شعروں کی زبان میں کہتی تھی اس کے ایک گیت کا ترجمہ یہ ہے

گھر سے نکلی کھیلن کو

پر لوٹ کے آنا بھولا

جب مغرب میں دن ڈوبا

میں ارباب کی پیاری بیٹی

حبّہ خوتن کہلائی

برقع پہنے بھیڑ سے نکلی

پھر بھی خلقت دیکھن آئی

جوگ لیا تو بڑے بڑوں سے جوگ کا دھندا چھوٹا

جب مغرب میں دن ڈوبا

گذشتہ دنوں جب ساغر صدیقی کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر پڑھی تو میرے ذہن میں بے اختیار حبّہ خاتون کے یہ مصرعے ابھر آئے اور نگاہوں کے سامنے ساغر صدیقی کی زندگی کے نشیب و فراز ایک فلم کی طرح گھوم گئے۔ اس کی دو تصویریں اور دو روپ میرے سامنے آئے۔ ان دو رُوپوں اور دو صورتوں میں کیا قدرِ مشترک تھی، میں یہ تو نہیں جانتا۔ اس کی شاعری اس کی زندگی کے دو کناروں کے درمیان ایک پل تھی۔ ایک راستہ تھی ایک رابطہ تھی!

میں نے پہلی بار مرحوم کو آج سے بائیس برس پیشتر اسلامیہ ہائی سکول سیالکوٹ کے "یومِ اقبال" کے مشاعرہ میں خوش الحانی اور سوز و گداز سے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ نہ صرف سنا اور دیکھا تھا بلکہ مشاعرہ کے اختتام کے بعد جو محفل مسلم لیگ کے دفتر میں جمی تھی اور طلوعِ سحر تک جاری رہی تھی اس میں بھی شریک تھا۔ اس شب اس نے بہت گیت سنائے۔ بہت غزلیں ترنم سے پڑھیں۔

اس سے اگلے سال کے مشاعرے میں ساغر صدیقی کو پھر بلایا گیا .... وہ

گلابی رنگ کی ریشمی بشرٹ، خاکی گبرڈین کی پتلون.... اور سفید جوتا پہنے تھا...... گھنگھریالے بال اور چہرے پر مسکراہٹ...... مگر آنکھوں میں خاموشی تھی جو کسی آنے والے طوفان کا پتا دیتی تھی..... مشاعرہ کے صدر شیخ انوار الحق جج ہائیکورٹ تھے اس مشاعرہ میں سیّد عبدالحمید عدم نے کہا تھا ؎

لو آج ہم بھی مطلعِ انوار ہو گئے

اور جب ساغر صدیقی کی باری آئی تو اس کی مترنم آواز گونجی ؎

حسرتوں کی حسین قبروں پر
پھول برساؤ وقت نازک ہے

ساغر صدیقی سیالکوٹ کے طلبا و طالبات کا محبوب شاعر بن گیا اور جب بھی وہاں پر کوئی محفلِ شعر و سخن منعقد ہوتی ساغر کو ضرور مدعو کیا جاتا...... اور وہ بھی ان مجالس میں ضرور شریک ہوتا...... اسی دور سے ایک برس بعد جب "یومِ اقبال" آیا..... تو پتلون کی جگہ پاجامہ تھا اور بشرٹ کی جگہ پھٹی ہوئی قمیص نے لے لی تھی. اس کے مداحوں کو بہت دُکھ ہوا...... اس شب اس نے اپنی غزلوں کے ساتھ ایک قطعہ بھی پڑھا تھا جو مجھے آج تک یاد ہے ؎

جانے والے ہماری محفل سے
چاند تاروں کو ساتھ لیتا جا
ہم خزاں سے نباہ کر لیں گے
تو بہاروں کو ساتھ لیتا جا

پرویز اصغر سودائی، اقبال ملک اور منظور بھٹی مرحوم اسے ہر سال سیالکوٹ بلاتے اور مشاعروں کی رونق کو بڑھاتے. مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ساغر صدیقی بعض شعرائے کرام کی مانند معاوضہ پر جھگڑتا نہ تھا اور مشاعرہ کے بعد خاموشی سے اپنا لفافہ لے کر چل دیتا تھا.!

دوسری تصویر "پنجاب پنچ" کے سرورق پر دیکھی تھی جہاں ساغر صدیقی گندگی کے ڈھیر کے قریب ایک میلی سی کالی چادر اوڑھے بیٹھا بڑے غور سے دور خلا میں دیکھ رہا تھا. اس کے مداحوں کو یہ تصویر دیکھ کر بہت رنج اور دکھ ہوا مگر جب کوئی انسان پیشۂ قلندری اختیار کر لیتا ہے

تو وہ ملبوسات کے تکلف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ واقعی "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" اور وہ ہر لباس کو ننگ وجود سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے میں جب ساغر صدیقی سے اس کے درویشانہ روپ میں "آستانۂ قلندریہ" چوک رنگ محل میں ملا تو مجھے حیرت نہ ہوئی البتہ دکھ ضرور ہوا۔ ساغر صدیقی سے میری ان ملاقاتوں کا سبب یہ ہوتا کہ جب بھی سیالکوٹ یا مظفر آباد میں مشاعرہ ہوتا تو وہاں کے منتظمین لاہور میں چند شعرائے کرام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مجھے لکھتے۔ بعض اوقات سیالکوٹ سے اقبال ملک اور مظفر آباد سے طالب خورشید آجاتے اور ہم شاعروں کو دعوت نامے دیتے۔ مظفر آباد میں جن شعرائے کرام کو شرکت کی دعوت دی جاتی ان میں سے بیشتر آسانی سے مل جاتے۔ مگر ہر بار جس شاعر کو ملنے اور ڈھونڈنے میں دقت پیش آتی وہ ساغر صدیقی ہی ہوتے ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کوئی گھر اور مسکن نہ تھا کوئی دفتر نہ تھا اور بقولِ ابنِ انشاء

ہم جنگل کے جوگی ہیں ہم کو ایک جگہ آرام کہاں

آج کل اس نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں

بہر نوع کبھی "آستانہ قلندریہ" میں اور کبھی حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار کے قرب و جوار میں یہ عظیم صوفی شاعر مست الست مل جاتا۔ ہم مدعا بیان کرتے، وہ صرف تاریخ اور دن اور وقت پوچھتا اور پھر ساغر صدیقی حسبِ وعدہ آن پہنچتا۔

ساغر صدیقی کا یہ معمول برسوں جاری رہا اور انہی ماہ و سال کی بے رحم گردشوں میں وہ تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ وہ نشے میں کیوں غرق ہوا؟ کس دکھ نے اس پیارے اور من موہنے شاعر کو روگی اور جوگی بنایا۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے یہ اس کی ذاتی زندگی کا مقدس راز تھا جس کو چھپانے کے لیے اس نے خود اپنی ظاہری شکل و صورت بگاڑ لی تھی کہ اس کو دکھی بنانے والا اسے اس بھری دنیا میں پہچان نہ لے مگر وہ خود دکھ اور غم کی آواز میں اسے پکارتا رہا۔ احمد فراز نے کیا خوب کہا ہے۔

میری آواز کے دکھ سے مجھے پہچان ذرا

میں تو یہ کہہ نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

وہ عاشقِ زار تھا اور عاشقِ حقیقی بھی، وہ معرفت کی تلاش میں دور تک نکل گیا ایک طرف

یہ بھی جانتا تھا کہ ؎

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

اسے یہ روحانی تسکین بھی تھی کہ اسے من کی دولت مل گئی تھی اور وہ اس بات پر نازاں تھا کہ

حاصل جسے ہو جائے عرفان محمدؐ کا
سایہ اسے دیتا ہے دامان محمدؐ کا

ساغرؔ صدیقی کی موت پر اس کے دوستوں، مداحوں اور اہلِ علم و فن نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سماج کی زیادتیوں اور بے مہریٔ عالم کا گلہ ہے مگر خود ساغرؔ کو کبھی سماج اور دوستوں سے شکوہ نہیں رہا وہ تو یہی بات کہتا کہتا تہہِ خاک جا چھپا کہ

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

کلیم اختر

شاعری عطیۂ فطرت ہے۔ محنت اور مشق کاری سے انسان صاحبِ کمال ہوتا ہے۔ احساس اور بیان کے مراحل سے گزر کر انسان وہ منزل حاصل کر لیتا ہے جو اس کے لیے بقائے دوام کا باعث بنتی ہے۔

اچانک اخبار میں ساغر صدیقی کے انتقال کی خبر پڑھنے سے بیتے دن نظروں کے سامنے آنے گئے۔

ساغر صدیقی قیامِ پاکستان سے ہی امرتسر سے لاہور آئے اور یہاں ہی گردشِ لیل و نہار دیکھی۔

عمر تو خاص نہ تھی، یہ کہیے کہ وقت ختم ہو گیا۔ پچاس سال میں ہی افسانۂ حیات مکمل ہو گیا۔

شروع شروع میں تکلفات کے سب لوازمات تھے لیکن آہستہ آہستہ تن ڈھانپنے پر ہی اکتفا رہا۔ سر کے بال بڑھے اور پھر پھیل کر ہی موجود رہے۔

بے نیازی اور مستی کے بڑے بڑے شاہکار نظر سے گزرے۔ خیام العصر، حضرت اختر شیرانی حضرت جگر مراد آبادی لیکن ساغر صدیقی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ وہ ان لوگوں کی صف میں آ سکتے تھے کہ جو محفل میں آ کر غیر آشنا کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ جس نے خلوص سے سلوک کیا۔ دل سے قدر دان رہے۔

وہ غزل بھی کہتے قطعہ اور رباعی بھی، گیت اور نظم بھی چند نعتیں بھی ان کی یادگار ہیں۔

جہاں تک فن کا تعلق ہے۔ اکثر و بیشتر اہلِ فن سے استفادہ کیا اور تہہِ دل سے نیاز مند رہے۔

خاص طور پر علامہ لطیف انور سے اصلاح لی۔ مجموعۂ کلام "خشتِ میکدہ" ہے۔

میرا تعارف علامہ لطیف انور نے ہی نگینہ بیکری انار کلی میں کرایا۔ فیاض ہاشمی اور مشیر کاظمی بھی موجود تھے۔ میرے متعلق یہ سن کر یومِ تعارف سے تا دمِ آخر سخت حیرت میں رہے کہ میں شعر نہیں کہتا۔ صرف زبان و بیان کے نکات کی تلاش نصب العین ہے اور انشا ہی مقصود ہے۔ میری یہی چیز ان کے دل میں جگہ پا چکی تھی۔ زندگی میں جہاں بھی ملے بڑے خلوص

سے ملے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں کہ بڑے ادب واحترام سے،

وہ خود کو حالات کی نذر ہونے سے بچانے میں بڑے کامیاب رہے۔ ورنہ یہ دنیا تو بڑے بڑوں کو لالچ کے دام میں پھنسا لیتی ہے،

پنجاب یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ سردار نشتر (گورنر) صدرِ مشاعرہ تھے۔ اختر شیرانی بھی ہندوستان سے آکر پہلی دفعہ اب لاہور میں شریک محفل تھے۔ بڑی کامیاب نظم پڑھی۔

وہ اب صوفی تھے۔ بڑی موثر نعت کہنے لگے تھے۔

نمکدان کراچی والے مجید لاہوری بھی شریک محفل تھے۔ میں ہر دو اصحاب کے سلام کے لیے مولانا تاجور کے حسب الحکم حاضر ہوا۔ محفل سے پہلے بھی ملا اور بعد میں بھی، مجید لاہوری مزاح کے اچھے نمونے یادگار چھوڑ گئے۔ محفل میں ساغر صدیقی بھی موجود تھے، لیکن کچھ رکے تھے۔ ایک دو بار پکارا گیا لیکن انکار تو نہ کرتے کچھ توقف کی مہلت چاہتے۔ میں نے علامہ لطیف انور سے کہا کہ آپ سامنے آئیں اور مائیک کے قریب لے آئیں۔ ترکیب کامیاب رہی۔ یہ مصرع تو نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا۔ سامعین تھے کہ جھوم رہے تھے ؎

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

علامہ لطیف انور کام سے ریڈیو سٹیشن سے فارغ ہوئے، میں انہیں گھر تک چھوڑنے کے لیے مال روڈ سے ہو کر جا رہا تھا۔ ہم جب چیئرنگ کراس پہنچے تو ساغر صدیقی نظر پڑے۔ میں نے اس خیال سے کہ چلو چند لمحے ساتھ رہیں گے۔ بلایا۔ بڑے خلوص سے ملے۔ ریگل چوک سے علامہ لطیف انور تو گھر کی طرف روانہ ہو گئے، ساغر صدیقی نے کہا کہ مجھے انارکلی تک چھوڑ آئیں۔ میں نے کہا۔ ہاں، ہاں۔ ہائیکورٹ کے پاس پہنچے تو ایک نظم سنانی شروع کی۔ بڑی اچھی چیز تھی۔ لاہور میں آندھی سے مسجد داتا دربار کا ایک مینارہ گر گیا تھا۔ یہ اسی کی طرف اشارہ تھا۔

داتا کی سجدہ گاہ کے مینار گر گئے

میں اپنی منزل کی طرف چلا اور وہ بجلی کے جگمگاتے بلبوں کی روشنی کے بالکل درمیان میں سے انارکلی میں داخل ہو گئے۔

میں خشک پھل چھالیا وغیرہ لینے اور کچھ پرانی کتابوں کے شوق میں انارکلی سے گزر رہا تھا

کہ ایک انسان دکھائی دیا۔ بڑا دکھ ہوا۔ بڑی عجیب حالت تھی، بال بکھرے، لباس خراب، دھوتی زمین پر جھاڑو دے رہی تھی۔ پکارا، سہارا دیا آنکھیں کھولیں، وہی ادب و احترام آپ میرے استاد کے دوست ہیں۔ کہو اچھے ہو۔ جی ہاں، زندہ ہوں۔ جب تک اس کی رضا ہے۔ پیٹ بھر لیا ہے۔ اب مجھے ادبی دنیا جانا ہے۔ میاں صلاح الدین کل پیشگی دے گئے تھے۔ دو غزلیں دے آؤں۔ میں ساتھ چل دیا۔ اتفاق کی بات کہ میاں صلاح الدین دفتر میں ہی تھے۔ غزلیں دیں اور لوٹ آئے۔ میں نے ساغر صدیقی سے ایک سوال کیا کہ صاحب کیا دور ہے مولانا صلاح الدین مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر یہ مثلث مولانا کہلاتی ہے۔ چہرے بشرے سے تو ایسا نہیں۔ ساغر صدیقی میرے اس سوال پہ بہت ہنسے اور کہا کہ صاحب ایسے لوگوں کو مولانا کہنا جائز ہے۔ ان کے علم اور معلومات کی بنا پہ کون کہتا ہے کہ وہ صرف شاعر ہی تھے۔ بڑے باخبر تھے۔ ہاں کسی نے ان کے جوہر نہ پرکھے اور نہ ان کے متعین راستوں نے انہیں نکھرنے دیا۔ ساغر صدیقی نے تو ایک لیکچر ہی دے ڈالا۔ میں سنتا رہا اور شعر ہی کی طرح داد دیتا رہا تاکہ وہ ایسی چیزوں کو بھی معمول بنائیں۔ لاہور چھاؤنی میں مشاعرہ تھا۔ سید عبدالحمید عدم اور سید عابد علی عابد موجود تھے۔ ساغر صدیقی بھی مدعو تھے۔ میں گیٹ پر ہی تھا کہ لائے گئے میں نے مقامی کی حیثیت سے استقبال کیا۔ آواز سے پہچان گئے۔ صاحب جی ہاں۔ یہ چھاؤنی ہے، یہ میری ریاست ہے کہو کیا کیا تحفہ دوں یا صرف سلامی ہی کافی ہے۔ باوجود خود فراموشی کے بڑی احتیاط سے جواب دیا صاحب جان و دل سے خدمت ہوگی۔ کئی غزلیں پڑھیں۔ بڑی داد پائی۔ فوراً ہی واپسی چاہی۔ میں ساتھ آگیا۔ لیکن چپ ہی رہے۔ میں نے کہا کہ میرے لیے کیا تحفہ ہے۔ کہا کہ اب تو استاد بھی نہیں رہے۔ آپ توجہ رکھا کریں۔ میں تہہ دل سے ممنون ہوں۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ محترمی ناصر کاظمی نے ہمارا ساتھ چھوڑا۔ تو ساغر صدیقی نے جب ان کے انتقال کا سنا تو بے ساختہ کہا ؎

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ایم بشیر گورداسپوری

انتخابِ کلامِ ساغر

ساغر صدیقی کی نعتیہ شاعری

حمد اور نعت لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا آسان۔ آسان اس لیے کہ موضوعات و واقعات اور ان کے پس منظر وہی ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان موضوعات کو جن جذبات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اصل تفاوت یہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان واقعات و موضوعات سے وابستگی اور اس وابستگی کا اظہار فرد کے ظرف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے میں نعت لکھنے کو مشکل فن کہتی ہوں۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ زبان زد عام فلمی گانوں کی طرز پر نعتیں لکھی جاتی ہیں اور بڑے فخر سے کتابچے پر لکھ دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں فلمی گانے پر لکھی گئی نعتیں۔ لکھنے والے کے خلوص نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس انداز سے لکھی ہوئی نعتیہ شاعری شاعر کے کمتر شعور اور لاعلمی کا پتا دیتی ہے۔ رسالت مآبؐ کی ذات بابرکات سے عشق عمر کے ابال کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ان سے محبت کرنے کے لیے تسخیر ذات ضروری ہے اور تسخیر ذات کی منزل کا راستہ اختیار کرنے ہی کو صوفیا مسلک کا نام دیتے ہیں، یہ سعادت نصیب ہونا بھی نصیب کی بات ہے۔

ساغر صدیقی غزل گو تھا۔ شاعر نغمہ طراز تھا، درویش تھا، میخوار تھا، مگر سالک تھا اس نے تسخیر ذات کے لیے عین عالم شباب میں دنیا تج دی اور فقیر ہو گیا۔ مسلسل سفر اور تلاش کا حاصل "سبز گنبد" کی بیس بائیس نعتیں ہیں۔

دنیا نے ساغر سے بے وفائی کی، ساغر نے دنیا کو ٹھکرا دیا۔ تاہم انسان تھا اور انسان محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محبت میں رسوائی اٹھانا پڑتی ہے اور پھر کہیں سرخرو ہوتا ہے مگر رسولؐ کی محبت ہے کہ انسان کی تطہیر کر دیتی ہے اور اہل دل جنوں کی تیرگی سے گزر جاتے ہیں۔

ساغر کی زندگی مسلسل تیرگی کا سفر تھا، لیکن اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ روشنی کو آواز دی:

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

اور

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے
فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے (غم بہار)

اس کی تمام شاعری میں اُجالے کی آرزو شدت لیے ہوئے ہے۔ روشنی کے وسائل پر غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس نے روشنی کے لیے جو استعارے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں سب کا ادراک اسے اسلامی کلچر اور اقدار کی وساطت سے ہوا۔ ساغر کے ذہن میں روشنی کا مینارہ و منبع صرف رسولؐ کی ذات تھی۔ کہتا ہے ؎

غم کے ماروں کا آسرا تم ہو
بے سہاروں کا آسرا تم ہو
تم سے یہ کائنات روشن ہے
چاند تاروں کا آسرا تم ہو

پھر ؎

ہزار شمس و قمر راہِ شوق سے گزرے
خیال حسن محمدؐ جو بار بار آیا

ساغر کے ایمان کو تقویت صرف اس حقیقت سے نہیں ملتی کہ رسولِ خداؐ آخری نبیؐ تھے اور ان کے بعد دین میں مزید ترمیم و اضافے کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ اسے ان کی بشریت اور اُمّی ہونے کے احساس نے بھی بتایا کہ وہ نبیؐ کامل ہیں۔

ایک اُمّی نبیؐ کو اے ساغر
تاج دارِ شعور کہتا ہوں
(سبز گنبد)

ایک اور جگہ کہا:

محمدؐ باعثِ حسنِ جہاں ایمان ہے میرا
محمدؐ حاصلِ کون و مکاں ایمان ہے میرا

جذباتی عقیدت سے قطع نظر اگر ہم رسول اللہؐ کو بحیثیت انسان دیکھیں تو ان کی ذات پاک میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو عام بشر کی فہم اور ہمت سے دور ہیں۔ وہ اُمّی تھے مگر بہبودِ انسانیت کا پورا شعور رکھتے تھے۔ انہیں اپنے سے پہلے آنے والے نبیوں، پیغمبروں، ان کی اُمتوں اور اُن کے انجاموں کا علم تھا۔ وہ قوموں کے عروج و زوال سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے ایسا ضابطۂ حیات پیش کیا جو انہیں حاصلِ کون و مکاں ثابت کرتا ہے۔
ساغر صدیقی رسولِ خداؐ کی زندگی ان کی تعلیمات کے منطقی نتیجے کے طور پر کہتا ہے۔

"محمدؐ باعثِ حسنِ جہاں ایمان ہے میرا"

اگر معاشرہ حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات پر عمل کرتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ساغر صدیقی کو اس میں وہ ناہمواری نظر آتی جس نے اسے جہاں کو ترک کر دینے پر مجبور کیا۔ وہ بھی انسان تھا۔ دل و دماغ رکھتا تھا۔ کبھی نوجوان تھا۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا اور اس کی نعمتوں میں اس کا بھی حصّہ تھا۔ مگر ظالم زمانہ نعمتوں کو اس کی دسترس سے دور لے گیا اور وہ عالمِ انتہائے رنج و غم میں یوں شکوہ کناں ہوا۔

دکھ درد کی سوغات ہے دنیا تری کیا ہے
اشکوں بھری برسات ہے دنیا تری کیا ہے
مجروحِ تقدّس ہے تقدّس کی حقیقت
رودادِ خرابات ہے، دنیا تری کیا ہے

اور

اپنے مجبور تقدس کے سہارے ساغر
دیر و کعبہ کے خداؤں سے لپٹ کر رولوں

(لوحِ جنوں)

ہر ذی شعور ضمیر رکھنے والے اور اہلِ دل شخص کی طرح ساغر بھی ایک ایسے معاشرے، ایسے دور کی امید کرتا ہے جو عظمتِ انسان کی عملی تصویر ہو۔ افلاطون نے یوٹوپیا کا تصور پیش کیا تھا مگر محمد مصطفےٰؐ نے اپنے عہدِ حیات ہی میں ایسی سوسائٹی تشکیل دی جس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا مصلح، ہادی اور فلاسفر پیش نہیں کر سکا۔ آپؐ نے بلند و پست، غریب و امیر، مہاجر و انصار کے فرق کو مٹا کر ایک بھائی چارے میں بدل دیا جس کو عقل بھی تسلیم کرتی تھی اور روح بھی سرشار ہوتی تھی۔ ساغر صدیقی اس بھائی چارے کی فضا کو بہت یاد کرتا ہے۔

جس کے ماتھے پہ نئی صبح کا جھومر ہو گا
ہم نے اس وقت کی دلہن کو بہت یاد کیا

(لوحِ جنوں)

لگا کوئی ضرب اس ادا سے کہ ٹوٹ جائیں دلوں کی مہریں
تری قسم تنگ آ گئے ہیں سکوتِ پنہاں سے لوگ ساقی

(غمِ بہار)

اپنی خالص نعتیہ شاعری میں بھی ساغر صدیقی کے جذبات اور رویہ یہی ہے۔

مرے گلستاں میں بہاروں کے خالق
بڑی دیر سے ہے خزاں کا مہینہ
مدد یا محمدؐ ڈراتی ہے مجھ کو
یہ مکار دنیا یہ رہزن حسینہ

(سبز گنبد)

برس رہی ہیں چمن پر گھٹائیں وحشت کی
بھٹک رہا ہے بہاروں کا قافلہ آؤ

(سبز گنبد)

مادی دنیا کی راحتیں، ان راحتوں کے حصول کی خواہشیں، سوگوار دل کے لیے کشش سے زیادہ مکار اور رہزن حسینہ کا روپ دھار کر ڈراتی ہیں۔ اس دنیا کو رہزن بہت سے سوچنے والوں نے گردانا ہے مگر ساغر جس انداز سے نعت میں کہتا ہے وہ منفرد ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نوخیز معصوم نوجوان خوفزدہ ہو کر ماں، محبت کرنے والے بھائی یا شفیق باپ کے سائے میں آ کر کہتا ہو "مجھے بچا لو ..... مجھے سہارا دو، میں بہت کمزور ہوں۔ یہ خود سپردگی کا عالم، یہ بھروسے کی فضا ساغر صدیقی کی تمام نعتوں میں موجود ہے۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہے ماسوائے رسولؐ کے۔ اسی سے اس کے روحانی سفر کا تعین ہوتا ہے کہ دنیا کے دکھ درد سے نجات کا راستہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا بتایا ہوا ہے۔ جس نے ان کی پناہ لے لی وہ خدا کے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوا۔ ساغر کو رسولِ خداؐ سے روایتی عقیدت نہیں۔ وہ انہیں سرپرست، ہمدرد غم خوار کے انداز سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے ۔

بھٹک رہا ہے بہاروں کا قافلہ آؤ

ساغر کی نعت کے لب و لہجہ میں گہری یگانگت، وابستگی اور ایک خاص قسم کی بے تکلفی جس میں احترام مقام و مرتبت ہو قائم ہے۔

اس کی نعتیں جذباتی نہیں۔ کہیں کہیں روایتی انداز کی جذباتیت موجود بھی ہے لیکن پوری نعت پڑھ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نعت پڑھی ہے جسے نئے اور آج کے شاعر نے لکھا ہے۔ ساغر کا تیقن ملاحظہ فرمائیے۔

مرے گلستاں میں بہاروں کے خالق
بڑی دیر سے ہے خزاں کا مہینہ

(فرخندہ لودھی)

در مدح حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

نعتِ رسولؐ

ساغرؔ صدیقی

جس طرف چشمِ محمدؐ کے اشارے ہو گئے
جتنے ذرے سامنے آئے ستارے ہو گئے

جب کبھی عشقِ محمدؐ کی عنایت ہو گئی
میرے آنسو کوثر و زمزم کے دھارے ہو گئے

موجۂ طوفاں میں جب نامِ محمدؐ لے لیا
ڈوبتی کشتی کے تنکے ہی سہارے ہو گئے

میں ہوں اور یادِ مدینہ اور ہیں تنہائیاں
اپنے بیگانے سبھی مجھ سے کنارے ہو گئے

اپنی کملی کا ذرا سایہ عنایت ہو مجھے
دل کے دشمن یا محمدؐ دل سے پیارے ہو گئے

اُسکی آنکھوں میں یقیناً باغِ جنت کچھ نہیں
جس کی آنکھوں کو مدینے کے نظارے ہو گئے

سبز گنبد کے لیے اشعارِ ساغرؔ مرحبا
جگمگا کر زندگی کے ماہ پارے ہو گئے

نعتِ رسولؐ

ــــــــــــــ ساغر صدیقی

تیرا دعویٰ تیرا مسلک قابلِ صد احترام
اے غریبوں اور ناداروں کے رکھوالے سلام
کہکشاں ہے تیرے رہوارِ مقدس کا غُبار
تیرے نقشِ پا ہیں فردوسِ بریں کے لالہ زار
دو جہانوں کے مقدر پر ہے تیرا اختیار
خالقِ کون و مکاں کے روبرو تیرا قیام
تیرا دعویٰ تیرا مسلک قابلِ صد احترام
تیرے در پہ سرنگوں ہیں آفتاب و ماہتاب
تو نے ختم المرسلینؐ کا حق سے پایا ہے خطاب
فکرِ انساں ہو نہیں سکتی وہاں تک باریاب
طائرِ سدرہ کو بھی حاصل نہیں تیرا مقام
تیرا دعویٰ تیرا مسلک قابلِ صد احترام
تیرے کوچے کی ہوا ہے چارہ سازِ رنج و غم
اک نویدِ جانفزا اک مژدۂ ابرِ کرم
تیرے قدموں کی قسم کھاتے ہیں پتھر کے صنم

ظلمتِ دوراں میں شمعِ آگہی تیرا کلام
تیرا دعویٰ تیرا مسلک قابلِ صد احترام
تا ابد روشن رہیں گے تیرے تابندہ اصول
اے خدا کو ماننے والے خدائی کے رسولؐ

بے نوا شاعر کے ویرانے میں بھی دو چار پھول
تیرے ہاتھوں میں بہارِ لالہ وگل کا نظام
تیرا دعویٰ تیرا مسلک قابلِ صد احترام

نعتِ رسولؐ

ساغرؔ صدیقی

آنکھ گلابی مست نظر ہے
اللہ ہی جانے کون بشر ہے

حُور و ملائک حاضرِ خدمت
عرشِ مُعلّٰی راہ گزر ہے

گیسوئے مُشکیں روحِ مُزّمل
رخ پہ طلُوعِ نورِ سحر ہے

ماتھے پہ روشن روشن سہرا
جلوۂ رنگیں حُسنِ قمر ہے

ابروئے عالی آیۂ قرآں
سینۂ اقدس کانِ گُہر ہے

مُہرِ نبوت پُشت پناہی
مسندِ یزداں آپؐ کا گھر ہے

چاند ستارے نقشِ کفِ پا
منزلِ ہستی گردِ سفر ہے

صبر و قناعت شانِ رسالت
سطوتِ شاہاں زیرِ اثر ہے

غارِ حرا تھی اس کی کمائی

ساری خدائی جس کا ثمر ہے

نامِ محمدؐ جگ اجیالا

لوگ کہیں جسے کملیؐ والا

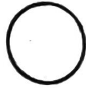
نعتیہ اشعار

_____ ساغر صدیقی

اس کی لوری کے لیے لفظ کہاں سے لاؤں
سارے عالم کے مقدر کو جگایا جس نے
جس کے جھولے پہ ملائک نے ترانے چھیڑے
قیصر و کسریٰ کی منڈیروں کو ہلایا جس نے



جو کھلونوں سے نہیں شمس و قمر سے کھیلے
جن پہ سایہ پرِ جبریلؑ کیا کرتے تھے
گود میں لے کے گزرتی تھی حلیمہ جس سمت
خار اس راہ کے خوشبو سی دیا کرتے تھے



جن کو الہام و نبوت کا امین ہونا تھا
جن سے قائم ہوئے بیدار نگاہی کے اصول
دوشِ براق پہ پہنچے جو سرِ عرشِ بریں
وہ خلاؤں کے پیغمبرؐ وہ فضاؤں کے رسولؐ

_____

قطعہ

دل ہاتھوں میں آجاتا ہے جب لوگ مدینے جاتے ہیں
بیتاب سماں تڑپاتا ہے جب لوگ مدینے جاتے ہیں
اے جی نہ ترس ہم اگلے برس ارمان نکالیں گے تیرے
جی ایسے کوئی بہلاتا ہے جب لوگ مدینے جاتے ہیں

ساغر صدیقی

نعت

دو ماہ گزرے میرے سیدھے ہاتھ پر فالج کا عارضہ مہربان ہوا۔ کاوش بٹ صاحب کے مالی تعاون نے خدا کا شکر ہے کہ ذہن کو محفوظ رکھا۔ جہانگیر جنجوعہ لالہ موسیٰ والے اور رائٹرز گلڈ کراچی کا کوئی پیسہ میرے ہاتھ نہیں لگا۔ یہ اطلاعاً عرض ہے۔ یہ نعت مفلوج ہاتھ اور محفوظ ذہن کے تعاون کا نتیجہ ہے۔

ساغر صدیقی ۱۹/۷۳/۱۱

سرمایۂ حیات ہے سیرت رسولؐ کی
اسرارِ کائنات ہے سیرت رسولؐ کی

پھولوں میں ہے ظہور ستاروں میں نور ہے
ذاتِ خدا کی بات ہے سیرت رسولؐ کی

بنجر دلوں کو آپؐ نے شاداب کر دیا
اک چشمۂ صفات ہے سیرت رسولؐ کی

چشمِ کلیم ایک تجلّی میں بک گئی
جلووں کی واردات ہے سیرت رسولؐ کی

جور و جفا کے واسطے برقِ ستم سہے
دنیاءِ التفات ہے سیرت رسولؐ کی

تصویرِ زندگی کو تکلّم عطا کیا
حسنِ تصورات ہے سیرت رسولؐ کی

ساغرؔ سرود و کیف کے ساغر چھلک اٹھے
صبحِ تجلیات ہے سیرت رسولؐ کی

جاری ہے دو جہاں پہ حکومت رسولؐ کی
کرتے ہیں مہر و ماہ اطاعت رسولؐ کی

ایمان ایک نام ہے حُبِّ رسولؐ کا
ہے خلد کی بہار محبت رسولؐ کی

غارِ حرا کو یاد ہیں سجدے حضورؐ کے
دیکھی ہے پتھروں نے عبادت رسولؐ کی

دامانِ عقل و ہوش سہارا نہ دے مجھے
چاہت خدا کی بن گئی چاہت رسولؐ کی

ساغرؔ تمام عالمِ ہستی ہے بے حجاب
آنکھوں میں بس رہی ہے وہ خلوت رسولؐ کی

اے کاش وہ دن کب آئیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
دامن میں مرادیں لائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
بیتابئ الفت کی دُھن میں ہم دیدۂ ودل کے بربط پر
توحید کے نغمے گائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
تھامیں گے سنہری جالی کو ، چومیں گے معطر پردوں کو
قسمت کو ذرا سلجھائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
زم زم میں بھگو کر دامن کو سرمستئ عرفاں پائیں گے
کوثر کے سبُو چھلکائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
ہنستی ہوئی کرنیں پھوٹیں گی ظلمات کے قلعے ٹوٹیں گے
جلووں کے علم لہرائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے
ہم خاکِ درِ اقدس لے کر پلکوں پہ سجائیں گے ساؔغر
یوں دل کا چمن مہکائیں گے جب ہم بھی مدینہ جائیں گے

لبوں پہ جس کے محمدؐ کا نام رہتا ہے
وہ راہِ خُلد میں محوِ خرام رہتا ہے

جو سر جھکائے محمدؐ کے آستانے پر
زمانہ اس کا ہمیشہ غلام رہتا ہے

ہمیں نہ چھیڑ کہ وارفتگانِ بطحا ہیں
ہمیں تو شوقِ مدینہ مدام رہتا ہے

وہ دو جہاں کے امیں ہیں انہیں کے ہاتھوں میں
سپردِ کون و مکاں کا نظام رہتا ہے

جو غمگسار ہے نادار اور غریبوں کا
وہ قدسیوں میں بھی عالی مقام رہتا ہے

لگن ہے آلِ مدینہ کی جس کے سینے میں
وہ زندگی میں بہت شادکام رہتا ہے

ہمیں ضرورتِ آبِ بقا نہیں ساغر
ہمارے سامنے کوثر کا جام رہتا ہے

محمدؐ باعثِ حسنِ جہاں ایمان ہے میرا
محمدؐ حاصلِ کون و مکاں ایمان ہے میرا
محمدؐ اوّل و آخر محمدؐ ظاہر و باطن
محمدؐ ہیں بہر صورت عیاں ایمان ہے میرا
شرف اک کملی والے نے جنہیں بخشا ہے قدموں کا
وہ صحرا بن گئے ہیں گلستاں ایمان ہے میرا
محبت ہے جسے غارِ حرا میں رونے والے سے
وہ انساں ہے خدا کا رازداں ایمان ہے میرا
معطر کر گئے ساغرؔ فضائے گلشنِ ہستی
نبیؐ کے گیسوئے عنبر فشاں ایمان ہے میرا

بزمِ کونین سجانے کے لیے آپؐ آئے
شمعِ توحید جلانے کے لیے آپؐ آئے

ایک پیغام جو ہر دل میں اُجالا کر دے
ساری دنیا کو سنانے کے لیے آپؐ آئے

ایک مدت سے بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
ایک مرکز پہ بلانے کے لیے آپؐ آئے

ناخدا بن کے اُبلتے ہوئے طوفانوں میں
کشتیاں پار لگانے کے لیے آپؐ آئے

قافلے والے بھٹک جائیں نہ منزل سے کہیں
دُور تک راہ دکھانے کے لیے آپؐ آئے

چشمِ بیدار کو اسرارِ خدائی بخشے
سونے والوں کو جگانے کے لیے آپؐ آئے

عکسِ تحریر

صحیفۂ عالم کے سینہ کینہ پر

احمقوں کا نزول ہوتا ہے

اشک سے درد کو سکون ملتا ہے

جب کبھی دل ملول ہوتا ہے

درویش

ساغر صدیقی

۱۰ مئی سنہ ۱۹۷ء

لاہور حجرہ کیلانی

آستانۂ فیضِ عالم

ایک فردوس کی حکایت کیا
جنتیں بے حساب دیکھی ہیں
فیضِ عالم کے آستانے پر
رحمتیں بے نقاب دیکھی ہیں

فیضِ عالم کی رہگزاروں پر
نقشِ پائے رسولؐ ملتے ہیں
تتلیاں رحمتوں کی رقصاں ہیں
جذب و مستی کے پھول ملتے ہیں

مرمریں تابناک دیواریں
غمزدوں کو قرار دیتی ہیں
ان پہ تعظیم سے نگاہیں ڈال
یہ مُقدّر سنوار دیتی ہیں

تربتِ گنج بخشؒ پر آکر
عبدیت کو فراغ ملتا ہے
اہلِ ایماں کو آپ کے دَر سے
لامکاں کا سُراغ ملتا ہے

قدسیوں کے ہجوم صف بستہ
حور و غلماں طواف کرتے ہیں
گردشِ دہر کے اسیروں کو
فیضِ عالمؒ معاف کرتے ہیں



حرف آغ



درد کے ماروں پہ ہنستا ہے زمانہ بے خبر
زخمِ ہستی کی کسک سے ہے نشانہ بے خبر

نکہتوں کے سائے میں ٹوٹے پڑے ہیں چند پھول
بجلیوں کی یورشوں سے آشیانہ بے خبر

حسنِ برہم کو نہیں حالِ پریشاں سے غرض
سازِ دل کی دھڑکنوں سے ہے ترانہ بے خبر

ہم قرارِ دل نہیں ہیں ہم نہیں آنکھوں کا نور
ہم سے آوارہ کا ہوتا ہے ٹھکانہ! بے خبر

دونوں عالم وسعتِ آغوش کی تفسیر ہیں
دیکھنے میں ہے نگاہِ محرمانہ بے خبر

آپ اپنے فن سے ناواقف ہے ساغرؔ کی نظر
لعل و گوہر کی ضیاؤں سے خزانہ بے خبر

درویش ساغرؔ صدیقی، اگست ۱۹۷۳ء

دستور یہاں بھی گونگے ہیں فرمان یہاں بھی اندھے ہیں

اے دوست خدا کا نام نہ لے ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

تقدیر کے کالے کمبل میں عظمت کے فسانے لپٹے ہیں

مضمون یہاں بھی بہرے ہیں عنوان یہاں بھی اندھے ہیں

زردار توقع رکھتا ہے نادار کی گاڑھی محنت پر

مزدور یہاں بھی دیوانے ذی شان یہاں بھی اندھے ہیں

کچھ لوگ بھروسہ کرتے ہیں تسبیح کے چلتے دانوں پر

بے چین یہاں یزداں کا جنوں انسان یہاں بھی اندھے ہیں

بے نام جفا کی راہوں پر کچھ دھول سی اڑتی رہتی ہے

حیراں ہیں دلوں کے آئینے نادان یہاں بھی اندھے ہیں

بے رنگ شفق سی ڈھلتی ہے بے نور سویرے ہوتے ہیں

شاعر کا تصوّر بھوکا ہے سلطان یہاں بھی اندھے ہیں

نکلے صدف کی آنکھ سے موتی مرے ہوئے
پھولوں کے دامنوں میں ہیں کانٹے چھپے ہوئے

ہے اہتمامِ گریہ و ماتم چمن چمن
رکھے ہیں مقتلوں میں جنازے سجے ہوئے

ہر ایک سنگ میل ہے اب ننگِ رہ گزر
ہیں رہبروں کی عقل پہ پتھر پڑے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہیں چمن کی تباہیاں
کچھ باغباں ہیں برق و شرر سے ملے ہوئے

اب میکدے میں بھی نہیں کچھ اہتمامِ کیف
ویران ہیں شعور تو دل ہیں بجھے ہوئے

ساؔغر یہ وارداتِ سخن بھی عجیب ہے
نغمہ طرازِ شوق ہوں لب ہیں سلے ہوئے

روداد محبت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے
دو دن کی مسرت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

جب جام دیا تھا ساقی نے جب دور چلا تھا محفل میں
اک ہوش کی ساعت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب وقت کے نازک ہونٹوں پر مجروح ترنم رقصاں ہے
بیداد مشیت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

احساس کے میخانے میں کہاں اب فکر و نظر کی قندیلیں
آلام کی شدت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ حال کے اندھے ساتھی تھے کچھ ماضی کے عیّار سجن
احباب کی چاہت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کانٹوں سے بھرا ہے دامنِ دل شبنم سے سلگتی ہیں پلکیں
پھولوں کی سخاوت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

اب اپنی حقیقت بھی ساغرؔ بے ربط کہانی لگتی ہے
دنیا کی حقیقت کیا کہیے کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے

کچھ لوگ بچھا کر کانٹوں کو گلشن کی توقع رکھتے ہیں
شعلوں کو ہوائیں دے دے کر ساون کی توقع رکھتے ہیں

ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اجڑی شاخوں سے
ہم اہلِ جنوں پھولوں سے بھرے دامن کی توقع رکھتے ہیں

جب سارا اثاثہ لُٹ جائے تسکینِ سفر ہو جاتی ہے
ہم راہنماؤں کے بدلے رہزن کی توقع رکھتے ہیں

سنگین چٹانوں سے دل کے دھڑکنے کی توقع رکھتے ہیں
ظلمت کے نگر میں نورانی آنگن کی توقع رکھتے ہیں

وہ گیسوئے جاناں ہوں ساغر یا گردشِ دوراں کے سائے
اے وائے مقدر دونوں سے الجھن کی توقع رکھتے ہیں

بھنور آنے کو ہے اے اہلِ کشتی نا خدا چُن لیں
چٹانوں سے جو ٹکرا لے وہ ساحل آشنا چُن لیں

زمانہ کہہ رہا ہے میں نئی کروٹ بدلتا ہوں
انوکھی منزلیں ہیں کچھ نرالے راہنما چُن لیں

اگر شمس و قمر کی روشنی پر کچھ اجارہ ہے
کسی بیدار ماتھے سے کوئی تارِ ضیا چُن لیں

اسیری میں کریں حسنِ گلستاں کی نگہبانی
قفس میں بیٹھ کر طائر ذرا رنگِ فضا چُن لیں

مگو لے نکہتِ گل کے نمائندے کہاں ساغر
سنیں جو بات پھولوں کی وہ ہمرازِ صبا چُن لیں

ترے غم کو متاعِ حسنِ انساں کرلیا میں نے
نگارِ آدمیت کو غزل خواں کرلیا میں نے

تڑپ کر سوزِ دل کو جلوہ ساماں کرلیا میں نے
بہت بے نور تھی دنیا چراغاں کرلیا میں نے

کسی کے اک تبسم پر اساسِ زندگی رکھ لی
شراروں کو نشیمن کا نگہباں کرلیا میں نے

اٹھا کر چوم لی ہیں چند مرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے تو یوں جشنِ بہاراں کرلیا میں نے

خدا رکھے یہ عذرِ جور باقی، تم نہ شرماؤ
اب اپنی آرزوؤں کو پشیماں کرلیا میں نے

ابھی تک بے کفن سی ہے مری وحشت کی عریانی
یہ کس امید پہ گھر کو بیاباں کرلیا میں نے

کبھی ساغر بکف میں وجد میں آیا جو لہرا کر
تو اپنے ساتھ دنیا کو بھی رقصاں کرلیا میں نے

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

جی میں آتا ہے الٹ دیں اُنکے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

شمع جس کی آبرو پر جان دے دے جھوم کر
وہ پتنگا جل تو جاتا ہے فنا ہوتا نہیں

اب تو مدت سے رہ و رسمِ نظارہ بند ہے
اب تو ان کا طُور پر بھی سامنا ہوتا نہیں

ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا نہیں

ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقامِ خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

ہائے یہ بیگانگی، اپنی نہیں مجھ کو خبر
ہائے یہ عالم کہ تو دل سے جدا ہوتا نہیں

بارہا دیکھا ہے ساغرؔ رہگذارِ عشق میں
کارواں کے ساتھ اکثر رہنما ہوتا نہیں

وقارِ انجمن ہم سے فروغِ انجمن ہم ہیں
سکوتِ شب سے پوچھو صبح کی پہلی کرن ہم ہیں

ہمیں سے گلستاں کی بجلیوں کو خاص نسبت ہے
بہاریں جانتی ہیں رونقِ صحنِ چمن ہم ہیں

زمانے کو نہ دے الزام اے ناواقفِ منزل
زمانے کی نظر ہم ہیں زمانے کا چلن ہم ہیں

طلوعِ آفتابِ نو ہمارے نام پر ہوگا
وہ جن کی خاک کے ذرّے میں خورشیدِ وطن ہم ہیں

بہرصورت ہماری ذات سے ہیں سلسلے سارے
جنوں کی سادگی ہم ہیں خرد کا بانکپن ہم ہیں

ہمارے ہاتھ میں ہے ساغرِ فردا ! ادھر دیکھو
ادھر دیکھو! حریفِ گردشِ چرخِ کہن ہم ہیں

یہ تیری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاک داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخ مرتب یہ حشر ساماں سے لوگ ساقی

اگر یہ اندھیرا اور کچھ دن رہا تو ایسا ضرور ہوگا
الجھ پڑیں گے بنامِ حالاتِ زلفِ جاناں سے لوگ ساقی

لگا کوئی ضرب اس ادا سے کہ ٹوٹ جائیں دلوں کی مہریں
تری قسم تنگ آ گئے ہیں سکوتِ پنہاں سے لوگ ساقی

لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ جلو میں صد انقلاب رقصاں
نہ جانے آتے ہیں کس جہاں سے یہ حشر ساماں سے لوگ ساقی

کوئی نیا رنگ بخش اس کو، کوئی نئی روح پھونک اس میں
گریز کرنے لگیں گے ورنہ حدیثِ یزداں سے لوگ ساقی

چمن کی خیرات چند کانٹے ہی ڈال دے دامنِ طلب میں
دگرنہ مر جائیں گے لپٹ کر درِ گلستاں سے لوگ ساقی

یہ جگنوؤں کی چمک پہ بھی اب سنبھال لیتے ہیں اپنا خرمن
مجھے یقیں ہے کہ ڈر گئے ہیں شبِ چراغاں سے لوگ ساقی

خیال ہے میکدے میں اک بار اور شعلوں کا راج ہوگا
شنید ہے انتقام لیں گے نشاطِ دوراں سے لوگ ساقی

اگرچہ ہم جا رہے ہیں محفل سے نالۂ دل فگار بن کر
مگر یقین ہے کہ لوٹ آئیں گے نغمۂ نو بہار بن کر

جہان والے ہمارے گیتوں سے جائزہ لیں گے سسکیوں کا
جہاں میں پھیل جائیں گے ہم بشر بشر کی پکار بن کر

بہار کی بدنصیب راتیں بلا رہی ہیں چلے بھی آؤ
کسی ستارے کا روپ بن کر کسی کے دل کا قرار بن کر

ضرورت راہ کے مطابق مسافروں نے بھی سیکھ لی ہے
وہ رہزنی مدتوں رہی ہے جو رہبروں کا شعار بن کر

تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ اک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

یہ کیا قیامت ہے باغبانو ! کہ جن کی خاطر بہار آئی !
وہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمہاری آنکھوں میں خار بن کر

ہر شے ہے پُر ملال، بڑی تیز دھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال، بڑی تیز دھوپ ہے

چکرا کے گر نہ جاؤں میں اس تیز دھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال، بڑی تیز دھوپ ہے

دے حکم بادلوں کو، خیاباں نشین ہوں
جام و سبو اُچھال، بڑی تیز دھوپ ہے

ممکن ہے ابرِ رحمتِ یزداں برس پڑے
زلفوں کی چھاؤں ڈال، بڑی تیز دھوپ ہے

اب شہرِ آرزو میں وہ رعنائیاں کہاں
ہیں گُل کدے نڈھال، بڑی تیز دھوپ ہے

سمجھی ہے جس کو سایۂ اُمید عقلِ خام
ساغرؔ کا ہے خیال، بڑی تیز دھوپ ہے

چراغِ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے

مجھے تمہاری نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سے پلاؤ بڑا اندھیرا ہے

بنام زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

ایک نغمہ ایک تارا، ایک غنچہ ایک جام
اے غمِ دوراں! غمِ دوراں تجھے میرا سلام
زلفِ آوارہ، گریباں چاک، گھبرائی نظر
ان دنوں یہ ہے جہاں میں زندگانی کا نظام
چند تارے ٹوٹ کر دامن میں میرے آگرے
میں نے پوچھا تھا ستاروں سے ترے غم کا مقام
کہہ رہے ہیں چند بچھڑے رہروؤں کے نقشِ پا
ہم کریں گے انقلابِ جستجو کا اہتمام
پڑ گئیں پیراہنِ صبحِ چمن پر سلوٹیں
یاد آ کر رہ گئی ہے بے خودی کی ایک شام
ہم بنائیں گے یہاں ساغرؔ نئی تصویرِ شوق
ہم تخیّل کے مجدّد ہم تصوّر کے امام

خیالِ یار میں ہم پُر بہار رہتے ہیں
خزاں کے دن بھی ہمیں سازگار رہتے ہیں

چمن میں صرف ہمارا ہی ذکر رہتا ہے
برنگِ لالہ ہمیں داغ دار رہتے ہیں

یہ اور بات کہ تم آئے ہو تو کوئی نہیں
وگرنہ غم تو یہاں بے شمار رہتے ہیں

جہانِ قدس بھی مری نظر سے گزرا ہے
وہاں بھی تری نظر کا شکار رہتے ہیں

تجھے خبر نہیں محلوں میں بیٹھنے والے
ترے فقیر سرِ راہ گزار رہتے ہیں

بصیرتوں کو نکھارا ہمیں نے اے ساغرؔ
تجلّیوں سے ہمیں ہمکنار رہتے ہیں

چمن سے برق و شرر سے خطاب کرتا ہوں
شعور و فکر و نظر سے خطاب کرتا ہوں

جبیں پہ سطوتِ الہام کے تقاضے ہیں
زبانِ قلب و نظر سے خطاب کرتا ہوں

میں ایک مردِ قلندر، میں ایک دیوانہ
طلوعِ نورِ سحر سے خطاب کرتا ہوں

نہ کارواں سے شکایت نہ رہنما سے گلہ
غبارِ راہ گزر سے خطاب کرتا ہوں

ہر ایک گام پہ ہیں پتھروں کی دیواریں
سکوتِ اہلِ ہنر سے خطاب کرتا ہوں

بنامِ عظمتِ یزداں کبھی کبھی ساغرؔ
وقارِ حسنِ بشر سے خطاب کرتا ہوں

برگشتۂ یزداں سے کچھ بھول ہوئی ہے
بھٹکے ہوئے انساں سے کچھ بھول ہوئی ہے

تارے سے چمک اُٹھے ہیں ساقی کی جبیں پر
شاید مرے ایمان سے کچھ بھول ہوئی ہے

تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہباں سے کچھ بھول ہوئی ہے

شاخوں پہ چٹکتے ہوئے غنچوں کو مبارک
اس زُلفِ پریشان سے کچھ بھول ہوئی ہے

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اُس عہد کے سلطاں سے کچھ بھول ہوئی ہے

ہنستے ہیں مری صورتِ مفتوں پہ شگوفے
میرے دلِ ناداں سے کچھ بھول ہوئی ہے

حوروں کی طلب اور مے و ساغر سے ہے نفرت
زاہد! ترے عرفاں سے کچھ بھول ہوئی ہے

ہے دُعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

ہم نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی چراغوں کی ضیا یاد نہیں

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

چھپائے دل میں غموں کا جہان بیٹھے ہیں
تمہاری بزم میں ہم بے زبان بیٹھے ہیں

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

وہ ایک لفظِ محبت ہی دل کا خونی ہے
جسے شریعتِ احساس مان بیٹھے ہیں

فغاں ہے درد ہے سوز و فراق و داغ و الم
ابھی تو گھر میں بہت مہربان بیٹھے ہیں

اب اور گردشِ تقدیر کیا ستائے گی
لُٹا کے عشق میں نام و نشان بیٹھے ہیں

ہے میکدے کی بہاروں سے دوستی ساغر
ورائے حدِ یقین و گمان بیٹھے ہیں

آوارگی برنگِ تماشا بُری نہیں
ذوقِ نظر ملے تو یہ دنیا بُری نہیں
کہتے ہیں تیری زلفِ پریشاں کو زندگی
اے دوست! زندگی کی تمنا بُری نہیں

ہے ناخدا کا میری تباہی سے واسطہ
میں جانتا ہوں نیتِ دریا بُری نہیں
ذوقِ جنوں کے ساتھ ہے بیدارئ خرد
شبنم کے ساتھ گرمئ شعلہ بُری نہیں

اِس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بُری نہیں
ساغر کے ساتھ چل کے کبھی میکدے میں سُن
اتنی حدیثِ بادہ و ساغر بُری نہیں

مآلِ نغمہ و ماتم فروخت ہوتا ہے
خوشی کے ساتھ یہاں غم فروخت ہوتا ہے

وہ جس کو آج بھی کچھ لوگ حسن کہتے ہیں
بصد نگارشِ پیہم فروخت ہوتا ہے

فریب خوردہ تبسم خریدنے کے لیے
وقارِ دیدۂ پُرنم فروخت ہوتا ہے

بڑے حسین گھنیرے سیاہ پردوں میں
جمالِ عصمتِ مریم فروخت ہوتا ہے

بہارِ وادئ گنگ و جمن کے ساتھ یہاں
وقارِ کوثر و زم زم فروخت ہوتا ہے

وہ جسم مرمریں، نظریں بھی جس کو چھو نہ سکیں
برائے رونقِ عالم فروخت ہوتا ہے

طلسم خانۂ صد رنگ و بُو میں اے ساغر
فریبِ شعلہ و شبنم فروخت ہوتا ہے

اے تغیرِ زمانہ یہ عجیب دل لگی ہے
نہ وقارِ دوستی ہے، نہ مجالِ دشمنی ہے

یہی ظلمتیں چھنیں جو ترے سرخ آنچلوں سے
انہی ظلمتوں سے شاید مرے گھر میں روشنی ہے

مرے ساتھ تم بھی چلنا مرے ساتھ تم بھی آنا
ذرا غم کے راستوں میں بڑی تیز تیرگی ہے

یہ مشاہدہ نہیں ہے مرے درد کی صدا ہے
مرے داغِ دل لئے ہیں تری بزم جب سجی ہے

غمِ زندگی! کہاں ہے ابھی وحشتوں سے فرصت
ترے ناز اٹھا ہی لیں گے ابھی زندگی پڑی ہے

جسے اپنا یار کہنا اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیثِ دلبراں ہے یہ کمالِ دلبری ہے

وہ گذر گیا ہے ساغرؔ کوئی قافلہ چمن سے
کہیں آگ جل رہی ہے کہیں راکھ سو گئی ہے

جام پی کر جو دور تک دیکھا
چشمِ ہستی نے طور تک دیکھا

یہ شرف آئینے کو حاصل ہے
آئینے نے حضور تک دیکھا

چشمِ دیوانہ وار جس کو ملی
اس نے حدِّ شعور تک دیکھا

ان کی زلفوں کا رنگ پایا ہے
جب بھی تخلیقِ نور تک دیکھا

عجز کی روشنی میں اے ساغر
ہم نے بامِ غرور تک دیکھا

ایسی تجلیاں ہیں کہاں آفتاب میں
انوارِ خاص ہیں مرے جامِ شراب میں
یزداں نے مسکرا کے بڑی دیر میں لکھا
اک لفظِ آرزو مرے دل کی کتاب میں

اب ذوقِ دید میں ہے شعورِ حیاتِ نو
جلووں کو احتیاط سے رکھو کتاب میں
محبوب تیرے حسن سے غنچوں کی آبرو
خوشبو ترے لبوں کی بسی ہے گلاب میں

ہے باغباں کی ترچھی نظر اتنی بات پر
شعلوں کا ذکر آ گیا شبنم کے باب میں
ساغرؔ کسی کی یاد میں جب اشکبار تھے
کتنے حسین دن تھے جہانِ خراب میں

ساغر صدیقی ______________

چمن پہ دام پہ، درویش مسکراتا ہے
ہر اک مقام پہ، درویش مسکراتا ہے

صراحی بزم میں جب قہقہے اگلتی ہے
سکوتِ جام پہ، درویش مسکراتا ہے

ہزار حشر اٹھائے تغیرِ دوراں
ترے خرام پہ، درویش مسکراتا ہے

شفق میں خونِ شہیداں کا رنگ شامل ہے
فروغِ شام پہ، درویش مسکراتا ہے

کبھی خدا سے شکایت کبھی گلہ خود سے
مذاقِ عام پہ، درویش مسکراتا ہے

ہوس مشیر ہو جس بادشاہ کی ساغرؔ
تو اس غلام پہ، درویش مسکراتا ہے

شام خزاں کی گُم صُم بولی
جیون لمحے زہر کی گولی

میرے آنسو اور ستارے
کھیل رہے ہیں آنکھ مچولی

دو پھولوں کی خاطر ترسیں
آج بہاروں کے ہمجولی

چاند کا سایہ چھت سے اترا
ہمسائے نے کھڑکی کھولی

توڑ دیا دم دیوانوں نے
عُمر جنوں کی پوری ہو لی

لمبی ہے تقدیر کی ڈوری
کس نے ناپی کس نے تولی

اپنی دنیا رین بسیرا !
اپنی دولت خالی جھولی

جسم کا زنداں روشن روشن
جب جی چاہا سوئی چبھو لی

میرے شعروں کا مجموعہ
مست غزالوں کی اک ٹولی

خاک درِ میخانہ ہم نے
ساقی پیمانوں میں گھولی
چھینٹ غمِ عصیاں کی ساغر
ہم نے شرابِ ناب سے دھولی

رہگذر کے چراغ ہیں ہم لوگ
آپ اپنا سراغ ہیں ہم لوگ

جل رہے ہیں نہ بجھ رہے ہیں دوست
کس کے سینے کا داغ ہیں ہم لوگ

خود تہی ہیں مگر پلاتے ہیں
میکدے کے ایاغ ہیں ہم لوگ

دشمنوں کو بھی دوست کہتے ہیں
کتنے عالی دماغ ہیں ہم لوگ

چشمِ تحقیر سے نہ دیکھ ہمیں
دامنوں کا فراغ ہیں ہم لوگ

ایک جھونکا نصیب ہے ساغر
اس گلی کے چراغ ہیں ہم لوگ

تم نے جو چاہا وہ دنیا بن گئی
آگ تھی پھولوں کا گجرا بن گئی

رات کچھ یوں مائلِ نغمہ تھا دل
چاندنی سازِ تمنا بن گئی

مرے جامِ مے سے اڑ کر ایک چھینٹ
صبح کے ماتھے کا قشقہ بن گئی

جب کسی صورت نہ عنواں بن سکا
آرزو بے نام صحرا بن گئی

زندگی کی بات سن کر کیا کہیں
اک تمنا تھی تقاضہ بن گئی

آبِ انگور سے وضو کر لو
دوستو! بیعتِ سبُو کر لو

گر بتا دیں گے بادشاہی کا
ہم فقیروں سے گفتگو کر لو

اُن سے ملنا کوئی محال نہیں
ان سے ملنے کی آرزو کر لو

دو قدم رائیگاں ہوئے تو کیا
دو قدم اور جُستجو کر لو

جشن زارِ حیات میں ساغرؔ
چار دن تم بھی ہاؤ ہُو کر لو

تفریق نے جادو ہی جگایا ہے بَلا کا
خطرے میں ہے اے یار! چمن مہر و وفا کا

توہین ہے درویش کی اس شہر میں جینا
ہو فاقہ کشی نام جہاں صبر و رضا کا

اب ان کا تفکر غمِ تقدیر کا چارہ
سینے میں پتا رکھتے تھے جو ارض و سما کا

جی چاہتا ہے اے مرے افکار کی مُورت
ملبوس بنا دوں تجھے تاروں کی ردا کا

جلتے ہوئے دیکھے وہی معصوم شگوفے
تھا جن کو بھروسہ ترے دامن کی ہوا کا

کچھ سرد سی آہیں ہیں تو کچھ ڈوبتے آنسو
ساغرؔ یہ صلہ تجھ کو ملا سوزِ نوا کا

اُچھال جام کہ تسخیرِ کائنات کریں
بکھیر زلف کہ تنظیمِ کائنات کریں
شکستِ بازیٔ دوراں ہے ایک جرعۂ مے
چلو کہ بازیٔ دوراں کو آج مات کریں
بجھا چراغِ نظر، لٹ چکی ہے بزمِ خیال
چلو کہ صبح کے تارے سے کوئی بات کریں
روش روش پہ سجائیں سخن کے گلدستے
بہارِ فکر سے تزئینِ کائنات کریں
وہ جن کو خوف ہو گردابِ وقت سے ساؔغر
وہ اپنی ناؤ سپردِ غمِ حیات کریں

کیا سماں تھا بہار سے پہلے
غم کہاں تھا بہار سے پہلے

ایک ننھا سا آرزو کا دیا
ضو فشاں تھا بہار سے پہلے

اے مرے دل کے داغ تو ہی بتا
تُو کہاں تھا بہار سے پہلے

پچھلی شب میں خزاں کا سناٹا
ہم زباں تھا بہار سے پہلے

اب جنازہ ہے چار تنکوں کا
آشیاں تھا بہار سے پہلے

چاندنی میں یہ آگ کا دریا
کب رواں تھا بہار سے پہلے

لُٹ گئی دل کی زندگی ساغر
دل جواں تھا بہار سے پہلے

پوچھا کسی نے حال کسی کا تو رو دیے
پانی میں عکس چاند کا دیکھا تو رو دیے

نغمہ کسی نے ساز پہ چھیڑا تو ہنس پڑے
غنچہ کسی نے شاخ سے توڑا تو رو دیے

اڑتا ہوا غبار سرِ راہ دیکھ کر
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیے

بادل فضا میں آپ کی تقدیر بن گئے
سایہ کوئی خیال سے گزرا تو رو دیے

رنگِ شفق سے آگ شگوفوں کو لگ گئی
ساغرؔ ہمارے ہاتھ سے چھلکا تو رو دیے

محبت مستقل غم ہے محبت غم کا گہوارہ
جو آنسو رنگ لے آئے وہی دامن کا شہ پارہ

میرا ذوقِ خریداری ہے اک جنسِ گراں مایہ
کبھی پھولوں کا شیدائی کبھی کانٹوں کا بنجارہ

جہاں منصب عطا ہوتے ہیں بے فکر و فراست بھی
وہاں ہر جستجو جھوٹی، وہاں ہر عزم ناکارہ

بسا اوقات چھو لیتی ہے دامن کبریائی کا
تمہاری جنبش ابرو، مری تخلیقِ آوارہ

نہ جانے محتسب کیوں میکدے کا نام لیتے ہیں
جہاں کچھ آدمی کرتے ہیں اپنے درد کا چارہ

ترے گیسو خیالوں کی گرفتِ ناز سے گزرے
کہ جیسے ایک جوگی بن میں لہراتا ہے دو تارہ

پلٹ آئے ہیں شاید انقلابِ دید کے لمحے
نظر کی وسعتوں میں ڈوبتا جاتا ہے نظارہ

فقط اک ہات میں ٹوٹا ہوا ساغر اٹھانے سے
لرز اٹھا ہے اے یزداں تری عظمت کا مینارہ

نہ خوفِ خدا ہے نہ خوفِ خدائی
بشر دے رہا ہے بشر کی دہائی

نہ جانے کہاں کھو گئی ہے مروّت
بڑی دور تک تو مرے ساتھ آئی

نگاہوں کے انداز بدلے گئے ہیں
وہی ہے مگر رسمِ جلوہ نمائی

کسی کے مہکتے ہوئے گیسوؤں سے
شگوفوں نے سیکھی ہے شعلہ نوائی

فضائے مقدر بدل دی ہے ساغر
نظر جب کبھی زندگی سے ملائی

تغیّرات سے دنیا سنگار کرتی ہے
یہ چاند توڑ کے جھومر میں رنگ بھرتی ہے

اُسی کلی سے ہے تاریخِ گلستاں روشن
جو باغباں کے لہو سے ذرا نکھرتی ہے

جسے نہ زہرِ جنوں کی ذرا سی چاٹ لگے
وہ بے شعور محبت ضرور مرتی ہے

دلوں کے بجھتے چراغوں کو نور دیتی ہے
وہ تیرگی جو تری زلف سے بکھرتی ہے

ہماری جنّتِ تخیل سے گزر جائے
بہار بن کے قیامت اگر گزرتی ہے

طلوعِ مہر ترے آستاں پہ ہوتا ہے
کرن کرن تری دہلیز پہ اترتی ہے

غنچے فضائے نو میں گرفتار ہو گئے
کچھ پھول اپنے رنگ سے بیزار ہو گئے
کتنے تصورات ہواؤں میں اُڑ گئے
کتنے خیال سایۂ دیوار ہو گئے
شبلی کا پھول جذبۂ منصور کی صدا
راہِ وفا میں تیغ کی جھنکار ہو گئے
ڈھلتی رہیں شعور میں تاروں کی تابشیں
اک جام پی کے صاحبِ اسرار ہو گئے
ہم بیکسوں کا چاند کی کرنوں سے واسطہ
زلفوں کو چھو لیا تو سزاوار ہو گئے
دل کی چبھن نے کیفِ تمنا بڑھا دیا
کانٹے بھی آج صورتِ گلزار ہو گئے
ساغرؔ کا بجلیوں نے سماں اور کر دیا
ہم ظلمتوں سے کھیل کے انوار ہو گئے

احتیاطاً فقر کا ہر مرحلہ کٹتا رہا
اتفاقاً آپ کی خیرات کا دھڑکا رہا

آج پھر شبنم کے قطروں نے بجایا جلترنگ
آج پھر دامن مری آواز کا بھیگا رہا

کوئی آیا ہے نہ آئیگا دلِ ناداں کوئی
میرے دروازے کا پردہ تو سدا ہلتا رہا

رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد بھی
دیر تک آنگن مرے احساس کا مہکا رہا

تیز رو چلتے ہیں ساغرؔ قافلے اس نام سے
رہنماؤں سے ہمیشہ راہزن اچھا رہا

بھولی ہوئی صدا ہوں مجھے یاد کیجیے
تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجیے

منزل نہیں ہوں خضر نہیں، راہزن نہیں
منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجیے

میری نگاہِ شوق سے ہر گُل ہے دیوتا
میں عشق کا خدا ہوں مجھے یاد کیجیے

نغموں کی ابتدا تھی کبھی میرے نام سے
اشکوں کی انتہا ہوں مجھے یاد کیجیے

گُم صُم کھڑی ہیں دونوں جہاں کی حقیقتیں
میں ان سے کہہ رہا ہوں مجھے یاد کیجئے

ساغرؔ کسی کے حسنِ تغافل شعار کی
بہکی ہوئی ادا ہوں مجھے یاد کیجیے

میں کہ آشفتہ و رُسوا سرِ بازار ہوا
چاک داماں کا تماشہ سرِ بازار ہوا

تری عصمت کی تجارت پسِ دیوار سہی
مری تقدیر کا سودا سرِ بازار ہوا

پھر کوئی اہلِ جنوں دار پہ چڑھ جائے گا
پھر ترے حُسن کا چرچا سرِ بازار ہوا

ہم نے رکھا ہے اُسے دل کے مکاں میں برسوں
جو کبھی ہم سے شناسا سرِ بازار ہوا

مرحلے دید کے دشوار تھے لیکن ساغر
منزلِ طُور کا جلوہ سرِ بازار ہوا

ہر شگوفہ سناں کی صورت ہے
موسمِ گل خزاں کی صورت ہے

لمحہ لمحہ ہے بوجھ سینے کا
وقت سنگِ گراں کی صورت ہے

ہے ورائے قرار آنسو بھی
درد اک مہرباں کی صورت ہے

راستے راہنمائے دیدہ و دل
زندگی کارواں کی صورت ہے

ذوقِ تدبیر ہو تو ہر ذرّہ
جلوہ کہکشاں کی صورت ہے

زندگی ہے گوش بر آواز
آدمی داستاں کی صورت ہے

ہائے دستورِ محفلِ ہستی
خامشی بھی زباں کی صورت ہے

میرے اشعار سُن کے فرمایا
ایک یہ بھی فغاں کی صورت ہے

اپنا ویرانۂ الم ساؔغر
ان دنوں گلستاں کی صورت ہے

زندگی کا رنگ دینا ہے تری بیداد کو
سرخیٔ خونِ تمنا چاہیے فرہاد کو

نامکمّل ہیں ابھی مظلوم کی رسوائیاں
پھر ذرا ترتیب دیجے ظلم کی رُوداد کو

دام کے حلقے لگائے تھے وہیں صیاد نے
صید نے معصوم سمجھا تھا جہاں صیاد کو

مرے خونِ آرزو سے زندگی کی آبرو
میں نے رنگیں کر دیا ہے عالمِ ایجاد کو

جُستجو پھر بھی ترے غم کی رہی احساس کو
در بدر لے کر پھرا ہوں اس دلِ ناشاد کو

راہرو ساغرؔ کسی سے دل لگاتے ہیں کہاں
منزلوں پر چھوڑ دیں گے راستے کی یاد کو

بات پھولوں کی سُنا کرتے تھے
ہم کبھی شعر کہا کرتے تھے

مشعلیں لے کے تمہارے غم کی
ہم اندھیروں میں چلا کرتے تھے

اب کہاں ایسی طبیعت والے
چوٹ کھا کر جو دعا کرتے تھے

ترکِ احساسِ محبت مشکل
ہاں مگر اہلِ وفا کرتے تھے

بکھری بکھری ہوئی زلفوں والے
قافلے روک لیا کرتے تھے

آج گلشن میں شگوفے ساغرؔ
شکوۂ بادِ صبا کرتے تھے

جھوم کر گاؤں میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

ایک سجدہ بنامِ مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ میں شرابی ہوں

اے دلِ بے قرار چپ ہو جا
جا چکی ہے بہار چپ ہو جا
اب نہ آئیں گے روٹھنے والے
دیدۂ اشکبار چپ ہو جا
جا چکا کاروانِ لالہ و گُل
اڑ رہا ہے غبار چپ ہو جا
چھوٹ جاتی ہے پھول سے خوشبو
رُوٹھ جاتے ہیں یار چپ ہو جا
ہم فقیروں کا اس زمانے میں
کون ہے غمگسار چپ ہو جا
حادثوں کی نہ آنکھ کھل جائے
حسرتِ سوگوار چپ ہو جا
گیت کی ضرب سے بھی اے ساغرؔ
ٹوٹ جاتے ہیں تار چپ ہو جا

روشن ہمیں سے منزلِ ہستی کے مرحلے
ہم کارواں کے ساتھ بہت دور تک چلے

اس شامِ غم کے بعد ہے اک ایسا راستہ
جس میں چراغ جلتے ہیں ظلمات کے تلے

اک عہدِ نَو بھی اپنا مداوا نہ کر سکا
لُطف و عطا کی گود میں جور و ستم پلے

چھیڑیں کسی کے گیسوئے برہم کی داستاں
رنج و الم کی رات کسی طرح تو ٹلے

پھرتے ہیں لوگ چاک گریباں گلی گلی
مجرُوح زندگی کو لگائے ہوئے گلے

ساؔغر سُلگ رہی ہے شگوفوں پہ چاندنی
سیرِ چمن کو نکلے ہیں دو چار دل جلے

اس درجہ عشق موجبِ رُسوائی بن گیا
میں آپ اپنے گھر کا تماشائی بن گیا

دیر و حرم کی راہ سے دل بچ گیا مگر
تیری گلی کے موڑ پہ سودائی بن گیا

بزمِ وفا میں آپ سے اک پل کا سامنا
یاد آگیا تو عہدِ شناسائی بن گیا

بے ساختہ بکھر گئی جلووں کی کائنات
آئینہ ٹوٹ کر تیری انگڑائی بن گیا

دیکھی جو رقص کرتی ہوئی موجِ زندگی
میرا خیال وقت کی شہنائی بن گیا

وہ بلائیں تو کیا تماشہ ہو
ہم نہ جائیں تو کیا تماشہ ہو

آج ہم بھی تری وفاؤں پر
مُسکرائیں تو کیا تماشہ ہو

یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشہ ہو

بندہ پرورا جو ہم پہ گزری ہے
ہم بتائیں تو کیا تماشہ ہو

ہم اگر اتفاق سے تُم کو
بھول جائیں تو کیا تماشہ ہو

وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشہ ہو

یاد آ کے رہ گئے ہیں زمانے وفاؤں کے
شعلے جگا کے چل دیے جھونکے ہواؤں کے

ہر اک قدم پہ تلخیٔ دوراں کی دھوپ تھی
تھے ہم بھی اس گلی میں طلبگار چھاؤں کے

کرتے رہے جو چاند ستاروں کی رہبری
کچھ لوگ منتظر ہیں انہیں رہنماؤں کے

ہر ذہن میں پڑے ہیں تری زُلف کے بھنور
ہر دل کی سرزمیں پہ نشاں تیرے پاؤں کے

بے چارگیٔ زیست کا دامن نہ بھر سکا
ہم نے لٹا دیے ہیں خزانے دعاؤں کے

تجدیدِ ذوقِ ساغر و مینا کی بات کر
بدلے ہوئے ہیں رنگ چمن کی فضاؤں کے

ہر موج ہے افسردہ تو مغموم ہیں دھارے
ایسے میں کوئی شورِ تلاطم کو پکارے

خود نکہتِ گل جرم چمن میں تھی ملوّث
جب غور سے دیکھا تو نہ بجلی نہ شرارے

مائل بہ تغیّر ہے یہاں فطرتِ بیتاب
بدنام ہیں ساقی کی نگاہوں کے اشارے

آئینِ مروت وہی ترتیب کرے گا
جو اپنے لہو سے رخِ آلام نکھارے

شاید کہ نئی فصل کی تقدیر جگا دیں
یہ ہوش میں ڈوبے ہوئے مدہوش نظارے

جب تک مرے ساغر میں چھلکتی رہی صہبا
احساس میں تابندہ رہے چاند ستارے

اے دوست یہاں ویرانوں کو گلزار سمجھنا پڑتا ہے
کچھ اونچی نیچی راہوں کو ہموار سمجھنا پڑتا ہے

احساس کے اُلٹے پاؤں سے جب چلتے چلتے تھک جائیں
تو راہ گزر کو اے راہی دیوار سمجھنا پڑتا ہے

مجروح معیشت کے ہاتھوں انسان کا اب یہ عالم ہے
ہر زخم لگانے والے کو غمخوار سمجھنا پڑتا ہے

جب شاہی قباؤں کی خاطر کچھ جسم برہنہ ہو جائیں
اس وقت غلاموں کو ساغرؔ مختار سمجھنا پڑتا ہے

کچھ علاجِ وحشتِ اہلِ نظر بھی چاہیے
ایک پتھر بر دکانِ شیشہ گر بھی چاہیے

نامکمل ہے سقُوطِ کارواں کی داستاں
اس میں تھوڑا سا بیانِ راہبر بھی چاہیے

گلستانِ آرزو کے انقلابی دور میں
ایک جشنِ موسمِ برق و شرر بھی چاہیے

جو لگا دیتے ہیں قصرِ زندگی میں آگ سی
ایسے شعلوں کے لیے اک اشکِ تر بھی چاہیے

پھر انھی انگڑائیوں میں حشر کے سامان ہوں
بزمِ جاناں میں کوئی آشفتہ سر بھی چاہیے

ہوں نہ ساغرؔ جس میں سنگِ میل کی پابندیاں
منزلوں تک ایک ایسی رہگذر بھی چاہیے

زہرِ قاتل ہے آبگینوں میں
سانپ پلتے ہیں آستینوں میں

چند قطرے ہیں خونِ سائل کے
اب شہنشاہ کے خزینوں میں

خیر ہو آسماں ستاروں کی
جگمگائے ہیں داغ سینوں میں

انقلابِ حیات کیا کہیے
آدمی ڈھل گئے مشینوں میں

میرے نغموں کا جی نہیں لگتا
ماہ پاروں میں، مہ جبینوں میں

جاؤ اہلِ خرد کی محفل میں
کیا کرو گے جنوں نشینوں میں

موج ساحل کو بڑھ کے چوم آئی
ہم تڑپتے رہے سفینوں میں

کچھ فرشتوں کا نام انساں ہے
میرے احساس کے قرینوں میں

اب شراروں کی فصل ہے ساغرؔ
رنگ اُگتے تھے جن زمینوں میں

سرِ مقتل ہمیں نغمات کی تعلیم دیتے ہیں
یہاں اہلِ نظر ظلمات کی تعلیم دیتے ہیں

یہاں کلیاں مہکتی ہیں مگر خوشبو نہیں ہوتی
شگوفے برملا آفات کی تعلیم دیتے ہیں

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں زرتابی قباؤں میں
سحر کا نام لے کررات کی تعلیم دیتے ہیں

جنہیں فیضانِ گلشن ہے نہ عرفانِ بہاراں ہے
وہ پھولوں کو نئے جذبات کی تعلیم دیتے ہیں

جہاں ساغر شرابِ زندگی اک زہرِ قاتل ہے
یقیں والے وہاں خدشات کی تعلیم دیتے ہیں

ستم جاگتے ہیں کرم سو رہے ہیں
محبت کے جاہ و حشم سو رہے ہیں

مرے نکتہ سازو! سخن کے خداؤ
پکارو کہ لوح و قلم سو رہے ہیں

ہر اک ذہن میں ہے خدائی کا دعویٰ
ہر اک آستیں میں صنم سو رہے ہیں

یہاں خوابِ ہستی فریبِ یقیں ہے
نہ تم سو رہے ہو نہ ہم سو رہے ہیں

وہاں چاندنی کے قدم ڈولتے ہیں
جہاں تیرے نقشِ قدم سو رہے ہیں

مری اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں میں ساغر
زمانے کے رنج و الم سو رہے ہیں

فریاد کے تقاضے ہیں نغمۂ سخن میں
الفاظ سو گئے ہیں کاغذ کے پیرہن میں

ہر آن ڈس رہی ہیں ماضی کی تلخ یادیں
محسوس کر رہا ہوں بے چارگی وطن میں

ٹکڑا کوئی عطا ہو احرامِ بندگی کا
سوراخ پڑ گئے ہیں اخلاص کے کفن میں

اے پاسبانِ گلشن تجھ کو خبر نہیں ہے
شعلے بھڑک رہے ہیں پھولوں کی انجمن میں

اے یار تیرے غم سے فرصت اگر ملی تو
تبدیلیاں کروں گا اس عالمِ کہن میں

دیکھا ہے میں نے دل کی بیتابیوں کا منظر
اک ٹوٹتی کلی میں اک ڈوبتی کرن میں

اس دردِ درد افشاں غنچوں کی داستاں تھی!
کانٹے سے چبھ رہے ہیں احساس کے بدن میں

بگڑا جو نقشِ زیست بنا شاہکارِ زیست
ایسے مٹے کہ بن گئے پروردگارِ زیست

کچھ اس طرح سے زیست کو اپناؤ دوستو
تا حشر موت کو بھی رہے انتظارِ زیست

اٹکی ہے نوکِ مژہ پہ لہو کی ایک بوند
کانٹوں میں پل رہی ہے عروسِ بہارِ زیست

لائیں غزل کے شہر سے تشبیہہ کے چراغ
اے ہم سخن چلو کہ سجائیں دیارِ زیست

ساغرؔ کی زندگی پہ کوئی تبصرہ نہ کر
اک شمع جل رہی ہے سرِ رہگذارِ زیست

چشمِ ساقی کی عنایات پہ پابندی ہے
ان دنوں وقت پہ حالات پہ پابندی ہے
دل شکن ہو کے چلے آئے تری محفل سے
تری محفل میں تو ہر بات پہ پابندی ہے
درد اٹھا ہے آنسو بن کے اُچھلنے کے لیئے
آج تک کہتے ہیں کہ جذبات پہ پابندی ہے
ہر تمنّا ہے کوئی ڈوبتا لمحہ جیسے
ساز مغموم ہیں نغمات پہ پابندی ہے
آگ سینوں میں لگی ہے ساغر و مینا چھلکے
کوئی کہتا تھا کہ برسات پہ پابندی ہے

خردِ بخیر! جنوں کو سلام کرنا ہے
جہانِ عشق میں اب اور کام کرنا ہے
کتابِ صورتِ کونین یوں اٹھانا ہے
ذرّے ذرّے کو مہرِ دوام کرنا ہے
صدائے بوذرؓ سلمانؓ یہی تھی دنیا میں
مسرتوں کو غریبوں کے نام کرنا ہے
جنہیں خدا کی طرح بولنے کی عادت ہے
انہیں زبانِ بشر میں کلام کرنا ہے
مرے شعور کو حاجت نہیں تکلّم کی
تجلیّوں کو نظر کا غلام کرنا ہے
کوئی حقیر سی شے ڈال میرے ساغر میں
کہ زندگی کو برائے عوام کرنا ہے

دو جہانوں کی خبر رکھتے ہیں
بادہ خانوں کی خبر رکھتے ہیں

خارزاروں سے تعلق ہے ہمیں
گلستانوں کی خبر رکھتے ہیں

ان کی گلیوں میں بسر ہوتی ہے
اور مکانوں کی خبر رکھتے ہیں

زخم ہنس ہنس کے جو کھا لیتے ہیں
وہ نشانوں کی خبر رکھتے ہیں

ہم اُلٹ دیتے ہیں صدیوں کے نقاب
ہم زمانوں کی خبر رکھتے ہیں

ہر قدم ذوقِ سفر زندہ ہے
کاروانوں کی خبر رکھتے ہیں

کچھ زمینوں کے ستارے ساغر
آسمانوں کی خبر رکھتے ہیں

جو حادثے یہ جہاں میرے نام کرتا ہے
مرا شعور انہیں نذرِ جام کرتا ہے

ہمارے چاکِ گریباں سے کھیلنے والو!
ہمیں بہار کا سورج سلام کرتا ہے

ہمیں سے قوسِ قزح کو ملی ہے رنگینی
ہمارے در پہ زمانہ قیام کرتا ہے

یہ میکدہ ہے یہاں کی ہر ایک شے کا حضور!
غمِ حیات بہت احترام کرتا ہے

یہی شراب یہی بے نظیر شے ساقی
اسی کا رنگ ہمیں لالہ فام کرتا ہے

فقیہہِ شہر نے تہمت لگائی ساغرؔ پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

کھلتے رہیں گے صحنِ چمن میں ہزار پھول
لیکن کہاں نصیبِ تمنا میں چار پھول

شاید یہیں کہیں ہو ترا نقشِ پائے ناز
ہم نے گرا دیے ہیں سرِ راہ گزار پھول

آوارگانِ شوق چلو ہم کریں تلاش
وہ کارواں جو چھوڑ گیا ہے غبارِ پھول

کانٹوں پہ جی لیے کبھی پھولوں پہ مر لیے
اپنی نظر میں ایک ہیں گلشن میں خار، پھول

ہائے شہیدِ ناز کی تربت پہ، رونقیں
مدھم سی ایک شمع ہے دو سوگوار پھول

ساغرؔ بہار میں نہ رہی مے کی جستجو
شیشے میں بھر کے پی گیا اک بادہ خوار پھول

راہزن آدمی راہنما آدمی
بارہا بن چکا ہے خدا آدمی

اُس کی مورتیں پُوجتے پُوجتے
ایک تصویر سی بن گیا آدمی ۔

کھل گئے بختوں کے وہاں زائچے
دو قدم جھوم کر جب چلا آدمی

زندگی خانقاہِ شہود و بقا
اور لوحِ مزارِ فنا آدمی

کچھ فرشتوں کی تقدیس کے واسطے
سہہ گیا آدمی کی جفا آدمی

گونجتی ہی رہے گی فلک در فلک
ہے مشیت کی ایسی صدا آدمی

منزلِ غم کی فضاؤں سے لپٹ کر رو لوں

ترے دامن کی ہواؤں سے لپٹ کر رو لوں

جامِ مے پینے سے پہلے مرا جی چاہتا ہے

بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹاؤں سے لپٹ کر رو لوں

زرد غنچوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالوں

سُرخ پھولوں کی قباؤں سے لپٹ کر رو لوں

آنے والے ترے رستے میں بچھاؤں آنکھیں

جانے والے ترے پاؤں سے لپٹ کر رو لوں

اپنے مجروح تقدّس کے سہارے ساغرؔ

دیر و کعبہ کے خداؤں سے لپٹ کر رو لوں

عظمتِ زندگی کو بیچ دیا
ہم نے اپنی خوشی کو بیچ دیا

رند جام و سبُو سے ہیں محروم
شیخ نے بندگی کو بیچ دیا

جگمگاتے ہیں وحشتوں کے دیار
عقل نے آدمی کو بیچ دیا

لب و رُخسار کے عوض ہم نے
سطوتِ خسُروی کو بیچ دیا

راہگزاروں پہ لُٹ گئی رادھا
شام نے بانسری کو بیچ دیا

عشق بہروپیا ہے اے ساغر
روپ نے سادگی کو بیچ دیا

دُکھ درد کی سوغات ہے دنیا تری کیا ہے
اشکوں بھری برسات ہے دنیا تری کیا ہے
کچھ لوگ یہاں نورِ سحر ڈھونڈ رہے ہیں
تاریک سی اک رات ہے دنیا تری کیا ہے
تقدیر کے چہرے کی شکن دیکھ رہا ہوں
آئینۂ حالات ہے دنیا تری کیا ہے
مجروحِ تقدس ہے تقدس کی حقیقت
رُو دادِ خرابات ہے دنیا تری کیا ہے
ساغر میں چھلکتے ہیں سماوات کے اسرار
ساقی کی کرامات ہے دنیا تری کیا ہے

یہ جو دیوانے سے دو چار نظر آتے ہیں
ان میں کچھ صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں

تیری محفل کا بھرم رکھتے ہیں سو جاتے ہیں
ورنہ یہ لوگ تو بیدار نظر آتے ہیں

دُور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
مرگِ امید کے آثار نظر آتے ہیں

میرے دامن میں شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ پھولوں کے خریدار نظر آتے ہیں

کل جنہیں چھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

اہلِ دل اہلِ نظر آج تیری محفل میں
سب کے سب نقش بہ دیوار نظر آتے ہیں

حشر میں کون گواہی میری دے گا ساغرؔ
سب تمہارے ہی طرفدار نظر آتے ہیں

آلام کی یورش میں بھی خورسند رہے ہیں

نیرنگئ حالات کے پابند رہے ہیں

آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی

نالے مرے افلاک کا پیوند رہے ہیں

ڈالی ہیں ترے خاک نشینوں نے کمندیں

ہر چند محلّات کے دربند رہے ہیں

ہر دور میں دیکھا ہے مری فکرِ رسا نے

کچھ لوگ زمانے کے خداوند رہے ہیں

ساغرؔ نہ ملی منزلِ مقصود، خرد کو

ہاں قافلۂ سالار جنوں مند رہے ہیں

فضائے نیم شبی کہہ رہی ہے سب اچھا
ہماری بادہ کشی کہہ رہی ہے سب اچھا

نہ اعتبارِ محبت نہ اختیارِ وفا
جنوں کی تیز روی کہہ رہی ہے سب اچھا

قفس میں یوں بھی تسلی بہار نے دی ہے
چٹک کے جیسے کلی کہہ رہی ہو سب اچھا

وہ آشنائے حقیقت نہیں تو کیا غم ہے
حدیثِ نامہ بری کہہ رہی ہے سب اچھا

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والو
نئی سحر کی گھڑی کہہ رہی ہے سب اچھا

حیات و موت کی تفریق کیا کریں ساغر
ہماری شانِ خودی کہہ رہی ہے سب اچھا

آزادیوں کے نام پر رسوائیاں ملیں
مشکل سے تیرے درد کی پنہائیاں ملیں

ساقی نے جھوٹ بولا ہے فصلِ بہار کا
گلشن میں صرف آپ کی انگڑائیاں ملیں

تجھ کو ملے ہیں قریۂ مہتاب میں گڑھے
مجھ کو تو پتھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

ہم نے انہیں کو صورتِ جاناں بنا لیا
دیوارِ آرزو پہ جو پرچھائیاں ملیں

ان پر نثار محفلِ ہستی کی رونقیں
اے دوست میکدے میں جو تنہائیاں ملیں

ہر تجربے میں ساغرِ مے کا جواز ہے
ہر فلسفے میں زُلف کی گہرائیاں ملیں

خون بادل سے برستے دیکھا
پھول کو شاخ پہ ڈستے دیکھا

کتنے بیدار خیالوں کو یہاں
دامِ اخلاص میں پھنستے دیکھا

دل کا گلشن کہ بیاباں ہی رہا
ایسا اُجڑا کہ نہ بستے دیکھا

کُھل گیا جن پہ مسرّت کا بھرم
پھر کبھی ان کو نہ ہنستے دیکھا

اب کہاں اشکِ ندامت ساغرؔ
آستینوں کو ترستے دیکھا

خوشا کہ باغِ بہاراں ہے زندگی اپنی
کسی کے غم میں فروزاں ہے زندگی اپنی

غمِ حیات نے ڈالے ہیں ہاتھ بڑھ بڑھ کر
کہ بے وطن کا گریباں ہے زندگی اپنی

ترا جہان ہے کیا ایک آئینہ خانہ
کہ جس میں ششدر و حیراں ہے زندگی اپنی

نہ جانے کون سا لمحہ چُرا کے لے جائے
متاعِ گردشِ دوراں ہے زندگی اپنی

نہ کوئی پھول نہ ساغر، نہ ماہتاب نہ تُو
بُجھا ہوا سا شبستاں ہے زندگی اپنی

نہ شانِ قیصر و کسریٰ نہ سطوتِ کے لا
غمِ بشر جسے کہتے ہیں جلد وہ شے لا
وقارِ لالہ و گل ہے نہ کیفِ رقصِ صبا
بہار میں بھی رہا دامنِ چمن پھیلا
جسے تصورِ انساں کشید کرتا ہے
شعور ڈوب کے نکلے نہ جس میں وہ شے لا
وہ جس کے پاس ہو زخمِ حیات کا مرہم
کہیں سے ڈھونڈ کوئی ایسا چارہ گر ہے لا
درِ سخاوتِ احساس بند ہے ساغرؔ
شکستِ کاسۂ مجنوں نہ اب درِ لیلے

اے دیوارو کچھ تو بولو
جھوٹی چُپ کے بندھن کھولو

شاید کوئی قُلزم نکلے
صحراؤں کی جیب ٹٹولو

ان کا وعدہ صبح کا تارہ
یہ چنگاری من میں چُبھولو

اس شب کی مجروح سحر تک
جلتے رہنا دل کے پھپھولو

رات کا پنچھی کہتا جائے
دن چڑھ آیا آنکھیں کھولو

پھُول کھلیں برسات میں جیسے
آج ذرا ہنس ہنس کر رولو

سادہ پانی مے بن جائے
ساغر کے اشعار کو گھولو

جب سے دیکھا پری جمالوں کو
موت آ گئی خیالوں کو

دیکھ تشنہ لبی کی بات نہ کر
آگ لگ جائے گی پیالوں کو

پھر اُفق سے کسی نے دیکھا ہے
مسکرا کر خراب حالوں کو

دونوں عالم پہ سرفرازی کا
ناز ہے تیرے پائمالوں کو

اس اندھیروں کے عہد میں ساغر
کیا کرے گا کوئی اجالوں کو

زلفوں کی گھٹائیں پی جاؤ
وہ جو بھی پلائیں پی جاؤ
اے تشنہ دہانِ جورِ خزاں
پھولوں کی ادائیں پی جاؤ
تاریکیٔ دوراں کے مارو
صبحوں کی ادائیں پی جاؤ
نغمات کا رس بھی تشنہ ہے
بربط کی صدائیں پی جاؤ
مخمور شرابوں کے بدلے
رنگیں خطائیں پی جاؤ
اشکوں کا مچلنا ٹھیک نہیں
بے چین دعائیں پی جاؤ
احساس کے ٹوٹے ساغر میں
یاروں کی وفائیں پی جاؤ

شمع اُس راہ پر جلی ہے ابھی
رنج کی شب کہاں ڈھلی ہے ابھی

گُل کھلے ہیں تمہاری آہٹ سے
آنکھ مہتاب نے ملی ہے ابھی

دل کہ جس کو فقیر کہتے ہیں
ایک اجڑی ہوئی گلی ہے ابھی

کاروبارِ جنوں کی گمنامی
شہرتِ عقل سے بھلی ہے ابھی

چاند اتریں گے رہگزاروں میں
رسمِ تابندگی چلی ہے ابھی

اب طبیعت بحال ہے ساغر
کچھ ذرا من میں بے کلی ہے ابھی

چاندنی شب ہے ستاروں کی ردائیں سی لو
عید آئی ہے بہاروں کی ردائیں سی لو
چشمِ ساقی سے کہو تشنہ امیدوں کے لیے
تم بھی کچھ بادہ گساروں کی ردائیں سی لو
ہر برس سوزنِ تقدیر چلا کرتی ہے
اب تو کچھ سینہ فگاروں کی ردائیں سی لو
لوگ کہتے ہیں تقدس کے سبو ٹوٹیں گے
جھومتی راہگذاروں کی ردائیں سی لو
قلزمِ خُلد سے ساغر کی صدا آئی ہے
اپنے بے تاب کناروں کی ردائیں سی لو

ہم بڑی دور سے آئے ہیں تمہاری خاطر
دل کے ارمان بھی لائے ہیں تمہاری خاطر

ایسا اک سنگ جو تالیفِ رہ و منزل ہو
منزلو ! ڈھونڈ کے آئے ہیں تمہاری خاطر

عہدِ روشن کے سخنور نہ بھلائیں گے ہمیں
ہم نے وہ سحر جگائے ہیں تمہاری خاطر

کتنی بے نام امیدوں کے دیے پچھلے پہر
ہم نے دریا میں بہائے ہیں تمہاری خاطر

ہم وہاں تھے کہ جہاں ساغر و مینا تھے مدام
دوستو! لوٹ کے آئے ہیں تمہاری خاطر

کچھ حرفِ التجا تھے دعاؤں سے ڈر گئے
ارمان بندگی کے خداؤں سے ڈر گئے

اب کون دیکھتا ہے ترے شمس کی طرف
سورج مکھی کے پھول شعاؤں سے ڈر گئے

ہنس کر جو جھیلتے تھے زمانے کی تلخیاں
اے چشمِ یار! تیری اداؤں سے ڈر گئے

رنگیں فضا میں جل گئیں خاموش تتلیاں
آنچل اُڑے تو پھول ہواؤں سے ڈر گئے

آہوں کو اعتبارِ سماعت سمجھ لیا
نغموں کی بے قرار صداؤں سے ڈر گئے

ساقی نے مسکرا کے گلے سے لگا لیے
وہ آدمی جو اپنی خطاؤں سے ڈر گئے

تشنہ لبی نے ساغر و مینا کو ڈس لیا
زُلفوں کی مست مست گھٹاؤں سے ڈر گئے

اے ستاروں کے چاہنے والو
آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں
رونقِ جشنِ رنگ و بُو کے لیے
زخم حاضر ہیں داغ حاضر ہیں

تشنگی تشنگی ارے توبہ
قطرے قطرے کو ہم ترستے ہیں
اے خداوندِ کوثر و تسنیم
ترے بادل کہاں برستے ہیں

کچھ نہیں مدعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا

ہوا مہکی مہکی فضا بھیگی بھیگی
چلو! آج مانگیں دعا بھیگی بھیگی

کسی کی بہکتی ہوئی تشنگی نے
بہاروں کو دیدی سزا بھیگی بھیگی

گھٹاؤں کی رحمت کو جوش آگیا ہے
کوئی ہوگئی ہے خطا بھیگی بھیگی

ذرا صندلیں ہاتھ نزدیک لاؤ
سلگنے لگی ہے حنا بھیگی بھیگی

حادثے کیا کیا تمہاری بے رخی سے ہو گئے
ساری دنیا کے لیے ہم اجنبی سے ہو گئے

گردشِ دوراں، زمانے کی نظر، آنکھوں کی نیند
کتنے دشمن ایک رسمِ دوستی سے ہو گئے

کچھ تمہارے گیسوؤں کی برہمی نے کر دیے
کچھ اندھیرے میرے گھر میں روشنی سے ہو گئے

دیکھ وہ ساغرؔ نظر آنے لگی ہیں منزلیں
مرحلے کچھ طے مری آوارگی سے ہو گئے

جبرِ ہستی میں خودی کا نام لو
ظلمتوں میں روشنی کا نام لو

پتھروں کو چاند کے ٹکڑے کہو
مر رہے ہیں زندگی کا نام لو

ہر شگوفہ ہے چمن میں ناتواں
احتیاطاً تازگی کا نام لو

وحشت و دیوانگی کے باب میں
بے تکلف آدمی کا نام لو

میں ہوں مرجھائی ہوئی کلیوں کا نقیب
تم فضائے شبنمی کا نام لو

راہ و منزل کے تقاضے ہیں نئے
رہبری یا رہزنی کا نام لو

کچھ تو ہو ساغر وقارِ شامِ غم
مسکرا کر بے کسی کا نام لو

جام ٹکراؤ ! وقت نازک ہے
رنگ چھلکاؤ ! وقت نازک ہے
حسرتوں کی حسین قبروں پر
پھول برساؤ ! وقت نازک ہے
اک فریب اور زندگی کے لیے
ہاتھ پھیلاؤ ! وقت نازک ہے
رنگ اڑنے لگا ہے پھولوں کا
اب تو آجاؤ ! وقت نازک ہے
تشنگی تشنگی ارے توبہ !
زلف لہراؤ ! وقت نازک ہے
بزمِ ساغر ہے گوش بر آواز
کچھ تو فرماؤ ! وقت نازک ہے

یہ جو شام و سحر کا میلہ ہے
سب تمہاری نظر کا میلہ ہے

بہتے دریا کی موج سے پوچھ
عاشقیِ چشمِ تر کا میلہ ہے

میرے برباد آشیاں کو نہ دیکھ
یہ بہاروں کے گھر کا میلہ ہے

پھر ملیں گے اگر بہار آئی
زندگی رہگذر کا میلہ ہے

چاندنی میں قرارِ دل نہ لُٹا
چاندنی رات بھر کا میلہ ہے

جل چکی شاخِ آشیاں اے دوست
پھر بھی برق و شرر کا میلہ ہے

کشتیٔ ماہ میں چلو ساغرؔ
آج راوی نگر کا میلہ ہے

ارے نا خداؤ ارے نا خداؤ
مجھے بھی بچاؤ، مجھے بھی بچاؤ
چراغاں ہے ظُلمت کدوں کا مداوا
نظر کو نکھارو، دلوں کو جلاؤ
ہمیں فُرصتِ آہ تک بھی نہیں ہے
انہیں یہ تکلّف کہ نغمے سناؤ
بکی کس کی عصمت لُٹی کس کی دنیا
تمہیں کیا تم اپنی دکانیں سجاؤ
تصوّر کی پاکیزگی چاہتے ہو
غمِ یار کی چاندنی میں نہاؤ
سرِ میکدہ لوگ بیٹھے ہیں ساغر
لبوں پر لیے تشنگی کے الاؤ

خزاں کے دور میں لُطفِ بہار لیتا ہوں
غمِ حیات کو ہنس کر گزار لیتا ہوں
گلوں سے رنگ ستاروں سے روشنی لے کر
جمالِ یار کا نقشہ اتار لیتا ہوں

ایسا بھی اک وقت آئے گا کون و مکاں تعظیم کریں گے
جو بھی کہیں گے دیوانے وہ اہلِ خرد تسلیم کریں گے
اب کے برس ہم گلشن والے اپنا حصہ پورا لیں گے
پھولوں کو تقسیم کریں گے، کانٹوں کو تقسیم کریں گے

عاشقی میں حُسن کا انداز رہنا چاہیے
سوز میں ہلکا سا رنگِ ساز رہنا چاہیے
جانے کب دے دے صدا کوئی حریمِ ناز سے
بزم والو گوشِ بر آواز رہنا چاہیے

آشنا ملتا نہیں نا آشنا سے مِل چلو
ہے تقاضۂ وفا اک بے وفا سے مِل چلو
میرا دعویٰ ہے کہ منزل مِل ہی جائے گی ضرور
شرط یہ ہے تم کسی کے نقشِ پا سے مل چلو

دیوانہ بے خودی میں بڑی بات کہہ گیا
اک حشر کی گھڑی کو ملاقات کہہ گیا
پہلا طرب شناس بڑا سنگدل تھا دوست
چیخیں تھیں جن کو جھوم کے نغمات کہہ گیا

ہزار مرحلۂ شوق سے گزر آئی
لہو میں ڈوب کے ہر آرزو نکھر آئی
سدا مہکتی رہے اے نسیمِ صبحِ بہار
یہ آج میرے خرابے میں تو کدھر آئی

یوں تو آنے کو بہت لوگ یہاں آئیں گے
ہم خرابات نشیں یار کہاں آئیں گے
لب تو سی لوں گا اے حرفِ تمنا کے حریف
اور وہ اشک جو بن بن کے زباں آئیں گے؟

نگاہوں سے نگاہیں مل گئی ہیں
بڑی آسان راہیں مل گئی ہیں
تمہارا شکریہ اے ہنسنے والو
مرے غم کو پناہیں مل گئی ہیں

ہر قدم پہ رقص فرماتے چلو
زندگی کے ساز پہ گاتے چلو
میں جلاتا ہوں چراغِ کارواں
تم ذرا دامن کو لہراتے چلو

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم آئے

اس منزلِ حیات سے گزرے ہیں اس طرح
جیسے کوئی غبار کسی کارواں کے ساتھ

تہذیبِ جنوں کار پہ تنقید کا حق ہے
گرتی ہوئی دیوار پہ تنقید کا حق ہے

ہاں! میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے

میں یاد دلاتا ہوں، شکایت نہیں کرتا
بھولے ہوئے اقرار پہ تنقید کا حق ہے

مجروح جو کر دے دلِ انساں کی حقیقت
اس شوخیٔ گفتار پہ تنقید کا حق ہے

نور و ظلمت کا احتساب نہ کر
وقت کا کاروبار سانجھا ہے
اس طلسمات کے جہاں میں حضور
کوئی کیدو ہے کوئی رانجھا ہے

ایسی مجروح تمنا ہی صلیبِ غم ہے
جس کو غنچے بھی بہاروں میں گرفتار ملیں

خونِ دل شرط ہے اے یار بصیرت کے لیے
یہ بھی ممکن ہے کہ صحراؤں میں گلزار ملیں

کاروبارِ وفا کا نام نہ لو
آدمی کی سزا کا نام نہ لو

راہزن شرمسار سے ہونگے
رہروو! رہنما کا نام نہ لو

کس نے توڑا ہے کاسۂ مجنوں
ان کے دستِ سخا کا نام نہ لو

کون چپکے سے پی کے گزرا ہے
زاہدِ پارسا کا نام نہ لو

رنگ اڑ جائیگا شگوفوں کا
اعتبارِ صبا کا نام نہ لو

ذوقِ انساں کی مفلسی ساغر
کہہ رہی ہے خدا کا نام نہ لو

جب گلستاں میں بہاروں کے قدم آتے ہیں
یاد بھولے ہوئے یاروں کے کرم آتے ہیں

لوگ جس بزم سے آتے ہیں ستارے لے کر
ہم اُسی بزم سے با دیدۂ نم آتے ہیں

میں وہ اک رندِ خرابات ہوں مے خانے میں
میرے سجدے کے لیے ساغرِ جم آتے ہیں

اب ملاقات میں وہ گرمیٔ جذبات کہاں
اب تو رکھنے وہ محبت کا بھرم آتے ہیں

قربِ ساقی کی وضاحت تو بڑی مشکل ہے
ایسے لمحے تھے جو تقدیر سے کم آتے ہیں

میں بھی جنّت سے نکالا ہوا اک بُت ہی تو ہوں
ذوقِ تخلیق تجھے کیسے ستم آتے ہیں

چشمِ ساغر ہے عبادت کے تصوّر میں سدا
دل کے کعبے میں خیالوں کے صنم آتے ہیں

کس کو بھاتی رہی رات بھر چاندنی
جی جلاتی رہی رات بھر چاندنی

ٹمٹماتے رہے حسرتوں کے دیے
مسکراتی رہی رات بھر چاندنی

اشک پیتے رہے ہم، کسی اور کو
مے پلاتی رہی رات بھر چاندنی

ایک شبنم کے قطرے کی تقدیر کو
آزماتی رہی رات بھر چاندنی

صبح دیکھا تنگو فے تھے لوٹے ہوئے
گل کھلاتی رہی رات بھر چاندنی

غم کے ساغر چھلکتے چھلکتے رہے
جگمگاتی رہی رات بھر چاندنی

یقین کر کہ یہ کہنہ نظام بدلے گا
مرا شعور مزاجِ عوام بدلے گا

یہ کہہ رہی ہیں فضائیں بہارِ ہستی کی
نیا طریقِ قفس اور دام بدلے گا

نفس نفس میں شرارے سے کروٹیں لیں گے
دِلوں میں جذبۂ محشر خرام بدلے گا

مروّتوں کے جنازے اٹھائے جائیں گے
سُنا ہے ذوقِ سلام و پیام بدلے گا

دل و نظر کو عطا ہوں گی مستیاں ساحرؔ
یہ بزمِ ساقی، یہ بادہ، یہ جام بدلے گا

ذرا گیسوئے یار کھولے گئے ہیں
تدبر کے بازار کھولے گئے ہیں

کئی بار تیری دفاؤں کے عُقدے
سرِ منزلِ دار کھولے گئے ہیں

میں وفائیں تلاش کرتا ہوں
تم جفائیں ذرا شمار کرو
ذوقِ منصور عام ہے ساغرؔ
اہتمامِ صلیب و دار کرو

نہ کشتیوں نہ کناروں کا احترام کرو
فقط بھنور کے اشاروں کا احترام کرو
یہیں سے گزرے گا اک روز کاروانِ بہار
فسردہ رہگزاروں کا احترام کرو
جو ہو سکے تو بدل دو نوشتۂ تقدیر
نہ ہو سکے تو ستاروں کا احترام کرو
خزاں کی گود میں بھی پھول مسکرائیں گے
کچھ اس طرح سے بہاروں کا احترام کرو
نشاط و کیف کی دنیا میں جھومنے والو
کبھی تو اجڑے دیاروں کا احترام کرو
یہی ہے ذوقِ عبادت کی انتہا ساغرؔ
غمِ حیات کے ماروں کا احترام کرو

آپ تیغِ بہار لے جائیں
مجھکو شامِ الم غنیمت ہے
اس تقدس کے قحط میں ساغر
اُن کا نقشِ قدم غنیمت ہے

کچھ مُدعا نہیں فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
اور تو کچھ نہیں صدا بابا
ہو بھلا کر بھلا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا
منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے رہنما فقیروں کا
ایک مدت سے خالی خالی ہے
کاسۂ التجا فقیروں کا
میکدے کی حدود میں ہو گے
کیا بتائیں پتا فقیروں کا
زلفِ جاناں کی نکہتیں ساغر
بن گئیں آسرا فقیروں کا

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے
معبدوں کے چراغ گل کر دو
قلبِ انساں میں اندھیرا ہے

گیت اس عہدِ بے تکلف میں
بربط و چنگ و نے کو ترسے ہیں
ساقیا تیرے بادہ خانے میں
نام ساغر ہے مے کو ترسے ہیں

سبُو سبُو سے خیالوں کی بھیک مانگی ہے
کرن کرن سے اجالوں کی بھیک مانگی ہے
نہ دے سکی یہ تہی ظرف سنگ دل دنیا
مری نظر نے سوالوں کی بھیک مانگی ہے

شامِ فرقت کا ماجرا میں ہوں
ایک بجھتا ہوا دیا میں ہوں
جس کو انساں کی موت کہتے ہیں
اس قیامت کی ابتدا میں ہوں

آؤ بادہ کشوں کی بستی سے
کوئی انسان ڈھونڈ کر لائیں
میں فسانے تلاش کرتا ہوں
آپ عنوان ڈھونڈ کر لائیں

آدمیت کا نام لیتے ہو
ریگ زاروں میں ناؤ کھیتے ہو
پھول چن کر چمن کے دامن سے
سنگ ریزوں کے دام دیتے ہو

وقت کے ہاتھ میں لہراتا ہے رم جھم کا رُباب
دور تک ایک نشیلا سا فسوں طاری ہے
اے مچلتے ہوئے لمحو! ذرا ہوشیار رہو
آج کی رات ستاروں پہ بہت بھاری ہے

مِٹ گئی بربادئ دل کی شکایت دوستو
اب گلستاں رکھ لیا ہے میں نے ویرانے کا نام
اس کو کہتے ہیں غمِ تقدیر کی نیلام گاہ
ہے زبانِ تشنگی میں اور میخانے کا نام

مرے عزیزو! مرے رفیقو! کوئی نئی داستان چھیڑو
غمِ زمانہ کی بات چھوڑو، یہ غم تو اب سازگار سا ہے
کبھی تو آؤ کبھی تو بیٹھو، کبھی تو دیکھو کبھی تو پوچھو
تمہاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے

یارب ترے جہاں کے کیا حال ہو گئے
کچھ لوگ خواہشات کے دلال ہو گئے
وحشت میں اپنے تارِ گریباں ہی دوستو
الجھے تو ہر قدم پہ گراں جال ہو گئے

میں وہ آوارۂ تقدیر ہوں یزداں کی قسم
لوگ دیوانہ سمجھ کر جسے سمجھاتے ہیں
سونے چاندی کی چمکتی ہوئی میزانوں میں
میرے جذبات کی تسکین نہیں ہو سکتی

اے ستاروں کے چاہنے والو
آنسوؤں کے چراغ حاضر ہیں
رونقِ جشنِ رنگ و بُو کے لیے
زخم حاضر ہیں داغ حاضر ہیں

وقت وارث کا صفحۂ قرطاس
ہیر دنیا کا اجنبی قصّہ
جھنگ سہتی کے مکر کی نگری
اور کیدو خیال کا حصّہ

میں نے لوح و قلم کی دنیا کو
جشنِ دار و صلیب سمجھا ہے
اے قفس کے جھانکنے والے
تجھکو کتنا قریب سمجھا ہے

ہم فقیروں کی صورتوں پہ نہ جا
ہم کئی روپ دھار لیتے ہیں
زندگی کے اُداس لمحوں کو
مسکرا کر گزار لیتے ہیں

لڑکھڑاتی ہوئی صدا سُن لو
داستانِ غمِ وفا سُن لو
سَب کی سنتے ہو حُسن کے داتا
ہم فقیروں کی بھی دُعا سُن لو

—

منتظر ہوں، کسی آوارہ گھٹا کی ڈولی
میرے تپتے ہوئے آنگن میں اتر آئے گی
اور گرجتے ہوئے بڑھتے ہوئے طوفانوں میں
صُبحِ دوراں کی نئی راہ نظر آئے گی

—

چشم کو اعتبار کی زحمت
دل کو صبر و شکیب دیتا ہے
آئینے میں نہ عکسِ ہستی دیکھ
آئینہ بھی فریب دیتا ہے

—

نظمیں

سوہنی مہینوال

ساغر صدیقی نے پنجاب کے شعری ادب پاروں
میں سے سوہنی مہینوال کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔
لیکن پورا ترجمہ کہیں بھی محفوظ نہیں۔ اس کا ابتدائی
حصہ ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔

منزلِ کامگار تھا گجرات

اے فضل شاہ تیرے دوہوں میں — داستانِ حیات ملتی ہے
حُسن کی دل گداز بانہوں میں — عشق کی کائنات ملتی ہے



شہرِ گجرات بر کنارِ چناب — مغلیہ دور کی نشانی ہے
اسی وادی کے دم سے وابستہ — حُسن اور عشق کی کہانی ہے



لوگ اس وادیٔ محبت کے — علم و عرفاں کا تاج رکھتے تھے
حُسن پرور سُلوک تھے اُن کے — عاشقانہ مزاج رکھتے تھے



زندگی سے رچے گلی کوچے — جن میں شرفائے وقت رہتے تھے
کشتیوں کے جلو میں تنکے بھی — موجِ ہستی کے ساتھ بہتے تھے



مسجدوں کے بلند مینارے — آسمانوں کی بات کرتے تھے
اہلِ دانش یہاں اشاروں میں — دو جہانوں کی بات کرتے تھے



بکھرے بکھرے سے گیسوؤں والے ہر مسافر کو ٹوک دیتے تھے
نوجواں حادثاتِ دوراں کو زورِ بازو سے روک دیتے تھے

○

ماہ پارے قیام کرتے تھے منزلِ کامگار تھا گجرات
مغلیہ دور کے گلستاں کی جگمگاتی بہار تھا گجرات

○

شہرِ گجرات کے حسین برتن چین و ایران بھیجے جاتے تھے
دور و نزدیک کے دیاروں میں گِل کے سامان بھیجے جاتے تھے

○

شہر گجرات کی حسیں گلیاں جن میں رقصِ بہار دیکھا ہے
سادہ مٹی کے برتنوں میں یہاں ذوقِ پروردگار دیکھا ہے

○

ہلکے ہلکے صراحیوں کے بدن جیسے پریاں ارم سے آئی ہوں
یا کوئی آیتیں تقدس کی اِذن لے کر حرم سے آئی ہوں

عید کا چاند

چاک دامن کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند

ان کے ابروئے خمیدہ کی طرح تیکھا ہے
اپنی آنکھوں میں بڑی دیر چھپا عید کا چاند

دُور ویران بسیرے میں دیا ہو جیسے
غم کی دیوار سے دیکھا تو لگا عید کا چاند

لے کے حالات کے صحراؤں میں آجاتا ہے
آج بھی خُلد کی رنگین فضا عید کا چاند

تلخیاں بڑھ گئیں جب زیست کے پیمانے میں
گھول کے درد کے ماروں نے پیا عید کا چاند

چشم تو وُسعتِ افلاک میں کھوئی ساغر
دل نے اک اور جگہ ڈھونڈ لیا عید کا چاند

عزیز بھٹی شہید کے بیٹے کے نام

پھول گلشن میں کھلیں تیری لطافت کے لیے
مسکرائے چاندنی تیری محبت کے لیے

تُو نہالِ سرفروشی کا درخشندہ ثمر
جگمگائے بزمِ ہستی تیری عظمت کے لیے

ہو طلوعِ صبحِ نو تیرے ہمکنے کی ادا
تُو ہو اک روشن ستارہ شامِ ظُلمت کے لیے

اے کہ! فرزندِ شجاعت غنچۂ فصلِ بہار
تیرے ہونٹوں کی ہنسی محسن ہو فطرت کے لیے

تیرا مُلکوتی تبسم آبروئے انتقام
تیری غوں غوں رجز ہو اک قوم و ملت کے لیے

تیرے ننھے ننھے بازو تیرے ننھے ننھے ہاتھ
ہوں سدا پرچم کُشا انساں کی عظمت کے لیے

سرورِ شہید

بج رہا تھا نیند کا دلکش رُباب
سج گیا اک آن میں ایوانِ خواب

جگمگائی ہے تقدّس کی بہار
دیکھتا کیا ہوں فرشتوں کی قطار

حُسنِ یزداں سے منوّر ہے جبیں
حُور و غلماں کے لبوں پر آفریں

چل رہے ہیں نور کی شمعیں لیے
جلوہ گاہِ طُور کی شمعیں لیے

یک بیک اک قبر پر آکر رُکے
فاتحہ پڑھنے کو تعظیماً جھکے

تھیں فضائیں دُور تک جلوہ نگار
جھلملایا روشنی میں اک مزار

تھیں فضائیں دُور تک جلوہ نگار
خاکِ مرقد کہکشاں آمیز تھی

آسمانوں سے مجھے آئی نوید
زندہ باد اے مدفنِ سرورِ شہید

چھ ستمبر کے گمنام شہید

چھ ستمبر کے شہید
فتح و نُصرت کی نوید

اک جہانِ آرزُو
اک نشانِ آرزُو

پردۂ عثمانؓ تُم
صدیقؓ کا ایمان تُم

تم عمرؓ کا ولولہ
اور علیؓ کا غلغلہ

تم ہو شمشیرِ حسینؑ
تم ہو تفسیرِ حسینؑ

تم وطن کے پاسباں
کامیاب و کامراں

تم رسالتؐ کے چراغ
تم قیامت کے ایاغ

صُبحِ بطحا کی کِرن
نازشِ قوم و وطن

قوم کے لختِ جگر
فاتحانِ بحر و بَر

کوہ سے ٹکرا گئے
ظُلمتوں پر چھا گئے

صحنِ کعبہ کی صدا
کلمۂ قرآں کی رِدا

سبز گنبد کی بہار
عظمتوں کے شاہکار

راستے فردوس کے
تم نے روشن کر دیے

شامی شہید

زندہ و پائندہ ہیں شامی شہید
خاکِ مرقد بابِ جنت کی کلید

ایک پیکر جراُتِ بیدار کے
مثل تھے فولاد کی دیوار کے

جورِ باطل کی اداؤں پر ہنسے
آگ برساتی فضاؤں پر ہنسے

روبرو کانٹوں کے سینہ کر دیا
نذرِ ناموسِ مدینہ کر دیا

ان کی تربت ہے وطن کی آبرو
اک مسلماں کے چلن کی آبرو

سانحہ اقصیٰ

انسان کی وحشت کیا کہیے انساں کے چلن میں آگ لگی
موسیٰؑ کا تقدس راکھ ہوا عیسیٰؑ کے وطن میں آگ لگی
توریت کی سطریں نوحہ کناں انجیل کے نغمے فریادی!
یعقوبؑ کے سجدے چیخ اُٹھے یوسفؑ کے چمن میں آگ لگی

احساس بہ سُن کر جل اُٹھا آدم کی امامت شعلوں میں
پھر چشمِ فلک نے دیکھی ہے اِسلام کی جنت شعلوں میں
قرآں نے بشارت دی جس کی وہ صبحِ تمنا آ پہنچی
کچھ اور سوا ہو جاتی ہے ایماں کی حرارت شعلوں میں

اے قبلۂ اوّل تیرے لیے ہم آخری سجدے لائیں گے
ہیکل کے منارے ٹوٹیں گے آئینِ جفا مٹ جائیں گے

اقصیٰ

گنبدِ مسجدِ اقصیٰ کی ضیا واپس لو
اپنے اسلاف کی عظمت کو ذرا واپس لو
آ رہی ہے یہ فضاؤں سے صدائے جوہر
قصرِ ایمان کی پُر نور ضیا واپس لو
پھر اٹھو خالدؓ و ضرارؓ و عبیدہؓ بن کر
سطوتِ عہدِ عمرؓ بہرِ خدا واپس لو
توڑ دو دستِ ستم دُرّۂ فاروقیؓ سے
پنجۂ جبر سے آئینِ وفا واپس لو
اس سے پہلے کہ اُتر آئے زمیں پر سورج
اپنی بیتاب جبینوں کا صلہ واپس لو

لیلیٰ خالد

اے فلسطین کی دُلہن

تیرا زیور جرأتوں کا بانکپن

تیری شہنائی سلاسل کی چھنن

تیرا کاجل ہے دھواں بارود کا

تیری مہندی بن گئی خاکِ وطن

اے فلسطین کی دُلہن

ہے تری بارات میدانِ وغا

تیری ڈولی، تیرا محمل مورچہ

ہے شہادت رسمِ ایجاب و قبول

توپ کا گولہ مبارک کی صدا

تیرا سہرا گولیاں ہیں اور گن

اے فلسطین کی دُلہن

ہے اسیری سے تری بلت گُلول

زخم تیری سیج کے رنگین پھول

لبلبی پستول کی کاکل کا خم

غازۂ رخسار ہے وادی کی دُھول

تیرا جھومر ہے شجاعت کا چلن

اے فلسطین کی دلہن

الفتح کا ایک مجاہد

اے مقدّس سرزمیں تیری قسم
تو نہیں تو زندگی بے نُور ہے
تیرے بیٹوں کی جبینوں کے لیے
تیرا ہر ذرّہ چراغِ طُور ہے

تجھ سے دل کی دھڑکنیں مخمور ہیں
تجھ سے تابندہ قلبِ آرزو
چھین لیں گے ایک دن اغیار سے
تیری گلیوں کی سُلگتی آبرو!

دل کے چھالوں کی بنا کر گولیاں
توپ اور بندوق لے کر آئیں گے
ظلم کے پُرزے اُڑانے کے لیے
دُرّۂ فاروقؓ لے کر آئیں گے

عزیز بھٹیؒ شہید

یہ مزارِ عزیز بھٹیؒ ہے
اس پہ رحمت سدا برستی ہے
ذرّہ ذرّہ ہے سجدہ گاہِ وفا
خاکِ مرقد تجلیوں کی رِدا
لوحِ تُربت شجاعتوں کی سند
گوشۂ خُلد گل بد دشِ لحد
حُور و غلماں دعائیں پڑھتے ہیں
باغِ جنت کے پھول چڑھتے ہیں
شانِ بازوئے حیدریؓ کا چلن
مُلک و ملت کا جاں نثارِ حسن!
کفر و باطل کی توڑ کر یلغار
دے گیا ایک منزلِ بیدار
اس کی سرشار جرأتوں کو سلام
اس کی بیدار عظمتوں کو سلام

نذرِ جہاد

اس عہدِ پُر فتن کی تطر سے اُلجھ پڑو
ہنگامہ ہائے شام و سحر سے اُلجھ پڑو

ہوگا روش روش پہ ہمارے جنُوں کا راج
بڑھ کر نگاہِ برق و شرر سے اُلجھ پڑو

للکارتی ہیں تم کو فلک بوس چوٹیاں
اتنا اُڑو کہ شمس و قمر سے اُلجھ پڑو

آتش میں کود جاؤ بعزمِ خلیلؓ شوق
منصوبہ ہائے موج و بھنور سے اُلجھ پڑو

بڑھتے چلو مجاہدو اللہ کی راہ میں
بیباک ہو کے خوف و خطر سے اُلجھ پڑو

اپنے وطن کی خاکِ مقدّس کے واسطے
ساغرؔ تجلیاتِ گہر سے اُلجھ پڑو

ہر اک فرد خیبر شکن ہو ہمارا

خدایا! ہمیں فتح و نصرت عطا کر
جہانِ مسلماں کو وسعت عطا کر

ہے پھر صدقِ صبر و رضا کی ضرورت
ہمیں سرفروشی کی عادت عطا کر

ہر اک فرد خیبر شکن ہو ہمارا
جوانوں کو حیدرؓ کی قوت عطا کر

چٹانوں سے ٹکرائیں تیرے فدائی
سمندر کو چیریں وہ جرأت عطا کر

صداقت کا پرچم رہے جگمگاتا
فضاؤں سے کھیلیں وہ فطرت عطا کر

مری بھیگی پلکوں کی فریاد سن لے
مرے گلستاں کو لطافت عطا کر

مری عرض سن! کملی والے کا صدقہ
تجھے سبز گنبد کے ہالے کا صدقہ

ضربِ محمود

امتحاں آن پڑا ہے تو کوئی بات نہیں
ہم نے سَو بار زمانے کے بھرم توڑے ہیں
ضربِ محمود ابھی زندہ و پائندہ ہے
ہم نے بت خانۂ دوراں کے صنم توڑے ہیں

جاگتی قوم کو للکار کے چھپنے والو
ارجن و بھیم کے کردار کی توہین ہو تم
دیدۂ وقت کو دیتے ہو فریبِ جمہور
خرمنِ امن میں اک شعلۂ رنگین ہو تم

تم نے سمجھا تھا کہ سویا ہے وہ مردِ آہن
جس کی للکار سے میدان دہل جاتے ہیں
جس کی شفاف جبیں پر ذرا گرد پڑے!
انقلابات زمانے کے سنبھل جاتے ہیں

قوتِ لشکرِ اسلام کو جھیلو تو سہی
بھول کر پنجۂ حیدرؓ سے الجھ بیٹھے ہو!
تند موجوں کے شناور سے ملائی ہے نظر
خاک و خون کے خوگر سے الجھ بیٹھے ہو!

کفر سے دست و گریباں ہی رہیں گے ساغرؔ
امن کی مشعلِ روشن کے امیں ہم ہی تو ہیں
ہم سے آزادیٔ احساس و نظر ہے منسوب
آسماں جس کو پکارے وہ زمیں ہم ہی تو ہیں

وقت آیا

اٹھو سائے میں تلواروں کے، پل کھانے کا وقت آیا
فضا میں پرچمِ توحید لہرانے کا وقت آیا

بنامِ زندگی اے سرفروشو نوکِ خنجر سے
حیات و موت کے عقدے کو سلجھانے کا وقت آیا

بڑھو شبیرؑ کے ذوقِ شہادت کی جھلک لے کر
کہ نیزے کی انّی پر رقص فرمانے کا وقت آیا

تمہیں ہو قاسم و محمود کی عظمت کے رکھوالے
بتانِ سوم کے چیلوں سے ٹکرانے کا وقت آیا

خدا رکھے! تمہیں ثابت قدم اے غازیو! مردو
سرِ میدان اک دیوار بن جانے کا وقت آیا

خودی کے پاسباں تم ہو خدا کے رازداں تم ہو
ذرا اسلاف کی ہمت کو دہرانے کا وقت آیا

جہانِ زندگی میں سازِ دل کی دھڑکنیں جاگیں
چلو ساغرؔ کی رجزِ زندگی گانے کا وقت آیا

میرے وطن

جانِ فردوس ہیں تیرے کوہ و دمن
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن
تجھ پہ صدقے ہے تن تجھ پہ قربان ہے من
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

تیرے دریاؤں میں ہیں سفینے رواں
اے مقامِ جہانگیر و نورجہاں
تیرا ہر قریہ ہے گلستاں بوستاں
تیرے کانٹے بھی ہیں مجھ کو غنچہ دہن
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

تیرے چک اور گاؤں ارم زاد ہیں
کھیتیاں آسمانوں کی بنیاد ہیں
تیرے دیہات تقدیس آباد ہیں
تیرے نغمے نئے اور ساز کہن
زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

تجھ میں لاہور ہے تجھ میں ملتان ہے

تو کہ وارث کا روشن قلمدان ہے

تو بلوچوں پٹھانوں کا قرآن ہے

تو کہ ایمان کے چاند کی ہے کرن

زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

تیرے آغوش میں ہے قلندرؒ کا در

تیری مٹی میں پنہاں ہے گنجِ شکرؒ

تو نے دیکھے ہیں داتاؒ سے اہلِ نظر

تو کہ سلطان باہوؒ کی ھُو کا وزن

زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

تو ہے خیبر کے در کا امیں اے وطن

کام تیرا ستارہ جبیں اے وطن

کوئی دنیا میں تجھ سا نہیں اے وطن

تیرے ذرّے بھی ہیں مجھ کو دُرِّ عدن

زندہ باد اے وطن زندہ باد اے وطن

"انقلابِ وقت"

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے
رہزنی غارت گری بیداد کی تشہیر ہے

عافیت ہے سر برہنہ آبرو نخچیر ہے
نعرۂ حق و صداقت لائقِ تعزیر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

ایک شب اجڑا کسی بابا کی بیٹی کا سہاگ
اُڑ گئی پھولوں کی خوشبو ڈس گئے کلیوں کو ناگ

ظلمتوں میں سو رہے ہیں چاندنی راتوں کے بھاگ
آدمیت ان دنوں اک لاشۂ تقدیر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

ایک بیچارے نے دم توڑا شفا گھر کے قریب
برق کے جھٹکے سے ٹھنڈا ہو گیا اک بدنصیب

لاریوں کی ٹکروں سے مر گئے کتنے غریب
آج ہر مظلوم کی فریاد بے تاثیر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

اک محلے سے کسی کا لاڈلا گم ہو گیا
وائے قسمت ایک بوڑھے کا عصا گُم ہو گیا

کارواں سے نغمۂ بانگِ درا گم ہو گیا
در پئے حلقومِ اصغر حرملہ کا تیر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

چھن گئی مزدور کی پونجی بھرے بازار میں
اور مجرم ہو گئے مفرور فوراً کار میں

روز چھپتی ہیں بھیانک سرخیاں اخبار میں
دیکھیے! اک خود کشی کی داستاں تحریر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

زندگی کرتی ہے جُرموں کی تجارت آجکل
چیختی ہے راہگذاروں پر شرافت آجکل

علم کے ماتھے پہ ہے داغِ جہالت آجکل
آج بے نام و نشاں اسلاف کی توقیر ہے

ایک یہ بھی انقلابِ وقت کی تصویر ہے

"پاکستان کے سیاستدان"

گرانی کی زنجیر پاؤں میں ہے
وطن کا مقدر گھٹاؤں میں ہے

اطاعت پہ ہے جبر کی پہرہ داری
قیادت کے ملبوس میں ہے شکاری

سیاست کے پھندے لگائے ہوئے ہیں
یہ روٹی کے دھندے جمائے ہوئے ہیں

یہ ہنس کر لہو قوم کا چوستے ہیں
خدا کی جگہ خواہشیں پوجتے ہیں

یہ ڈالر میں آئین کو تولتے ہیں
یہ لہجے میں سرمائے کے بولتے ہیں

ہے غارتگری اہلِ ایماں کا شیوہ
بھلایا شیاطیں نے قرآں کا شیوہ

اٹھو! نوجوانو وطن کو بچاؤ
شراروں سے حدِ چمن کو بچاؤ

(ساغر نے یہ نظم ۱۹۷۱ سے پہلے لکھی تھی)

جنگی قیدیوں کے لیے دُعا

گلوں کے اشارے دُعا کر رہے ہیں
چمن کے نظارے دُعا کر رہے ہیں

مٹے شب کی تاریکیوں کا اَلم
چمک کر ستارے دعا کر رہے ہیں

ہمیں دین و دنیا میں بے شل کر دے
کہ دامن پسارے دعا کر رہے ہیں

رہائی اسیروں کی ہو یا محمدؐ
فدائی تمہارے دعا کر رہے ہیں

ہمیں صبرِ شبیرؓ سے آشنا کر
کہ اشکوں کے دھارے دعا کر رہے ہیں

فسردہ چراغوں کو پُر نور کر دے
مُرادوں سے دامن کو معمور کر دے

کوئلے والیاں

جھولیوں میں کوئلے پتھر کے اور مٹی کے روڑ
گاہے گاہے زندگی کے بے محل نشے کا توڑ

ٹوٹے پھوٹے آئینوں میں حُسنِ فطرت کی جھلک
ہے غبارِ راہ سے ان کی جبینوں پر دمک

اُجڑے اُجڑے سے گریباں ویراں ویراں سے جمال
کوئلے سے لکھ دیے کس نے ریاضی کے سوال

گیسوؤں میں گردشِ ایّام کی سی اُلجھنیں
سانولے چہروں میں صبح و شام کی سی اُلجھنیں

اپنے لٹکے آنچلوں سے بے خبر دُھن میں رواں
ہوٹلوں کی بھٹیاں یہ چائے خانوں کا دھواں

گھومتی رہتی ہیں دن بھر کُوچہ و بازار میں
ایک حصّہ یہ بھی ہیں دنیا کے کاروبار میں

ان کے گرد و پیش لاکھوں داستانوں کے ہجوم
ان کے پتھر بن سکیں گے کیا کبھی ماہ و نجوم؟

ان کے دامن میں کوئی موتی نہیں تارہ نہیں
ان کی قسمت میں شبستانوں کا نظارہ نہیں

شہر سے کچھ دُور ان کے جھونپڑے آباد ہیں
یہ لبِ تقدیر پر ہنستی ہوئی فریاد ہیں

کانچ کی چوڑی سے ارزاں انکی قسمت کا نگیں
ان کے مذہب میں جہنم کا کوئی خطرہ نہیں

چل بصیرت کی عبا میں ایک تکمہ یہ بھی ٹانک
کارخانوں اور ملوں کے بند دروازوں میں جھانک

چند سکوں کے لیے ہے بنتِ صحرا کا وقار
ان کے پہلو میں تصوّر اور خیالوں کے مزار

چار پیسے کی کھنک ان کے لیے پائل کا راگ
چھپ کے ٹھنڈی راکھ میں سوئے ہوئے ہیں انکے بھاگ

ملگجے ملبوس ان کے بے نیازِ رنگ و نور
کوئلوں کا ڈھیر ہے ان کی جوانی کا غرور

اک شرارہ پھینک دو سارا الاؤ جل اٹھے
اک ذرا گرمی سے آنکھیں ہی ملاؤ جل اٹھے

شام کے ڈھلتے ہوئے سائے جدھر جاتے ہیں دوست
ان کی تقدیروں کے مالک اس طرف آتے ہیں دوست

عورت

اگر بزمِ ہستی میں عورت نہ ہوتی
خیالوں کی رنگین جنت نہ ہوتی

ستاروں کے دلکش فسانے نہ ہوتے
بہاروں کی نازک حقیقت نہ ہوتی

جبینوں پہ نورِ مسرت نہ کھلتا
نگاہوں میں شانِ مروّت نہ ہوتی

گھٹاؤں کی آمد کو ساون ترستے
فضاؤں میں بہکی بغاوت نہ ہوتی

فقیروں کو عرفانِ ہستی نہ ہوتا
عطا زاہدوں کو عبادت نہ ہوتی

مسافر سدا منزلوں پہ بھٹکتے
سفینوں کو ساحل کی قربت نہ ہوتی

ہر اک پھول کا رنگ پھیکا سا رہتا
نسیمِ بہاراں میں نکہت نہ ہوتی

خدائی کا انصاف خاموش رہتا
سنا ہے کسی کی شفاعت نہ ہوتی

ترانہ

چمن چمن، کلی کلی، روش روش پکار دو
وطن کو سرفروش دو، وطن کو جاں نثار دو
جو اپنے غیضِ بے کراں سے کوہسار پیس دیں
جو آسماں کو چیر دیں، ہمیں وہ شہسوار دو
یہی ہے عظمتوں کا اک اصولِ جاوداں حضور
امیر کو شجاعتیں، غریب کو وقار دو
نظر نظر میں موجزن تجلّیوں کے قافلے
وہ جذبۂ حیاتِ نو بشر بشر ابھار دو
شعور کے لباس میں صداقتیں ہیں منتظر
خلوص و اعتبار کے جہان کو نکھار دو
تصوراتِ زندگی کو پھر لہو کا رنگ دیں
چلو! جنوں کی وسعتوں پہ دانشوں کو وار دو
فضائیں جس کی نکہتوں سے ہوں وقارِ گلستاں
تو ایسے ایک پھول کو ستارۂ بہار دو
جو قلب و دل کے ساتھ ساتھ میکدے کو پھونک دے
مجھے خدا کے واسطے وہ جامِ پُر شرار دو
چھلک رہا ہے خلوتوں میں ساغرِ مشاہدات
اٹھو سخنورو! زمیں پہ کہکشاں اتار دو

پنجاب رنگ

(پنجابی نظمیں)

چومصرعے

لمیاں سوچاں، ڈونگھیاں سوچاں رجھیڑیاں سوچاں اٹھیاں سوچاں
سوچ دا رہندا اے دل میرا، ہر دم دِن سوتّیاں سوچاں
غم دے چھلیڈے رنج دے سائے پیر دی گرد ں لے نہ سکے
ساقی تیرے در دے اُتے ساغر دے نال بھنیاں سوچاں

او علاقہ غیر اے تے ایہہ علاقہ اپنا
پے گیا انسان نوں اج پُل صراتوں ٹپنا
زندگی عقل و فراست دی بڑی محتاج اے
آدمی نوں چاہی دا اے ناں علی دا جپنا
دار تے منصور دا ٹھیکہ تے نئیں اے دوستو!
رُوبرو حق و صداقت دے کدے نئیں چھپنا

ایہہ دل دے زخم پرانے
توں جانے تے بھاویں نہ جانے
ایہہ ہنجو بڑے نمانے
توں جانے تے بھاویں نہ جانے
اسی ہس کے قیداں کٹ نے آں اسی دار تے ہونٹے لینے آں
ایہہ گل زمانہ جانے، توں جانے تے بھاویں نہ جانے

گل کوئی عشق دی کر پیار دا قصہ سنا
داستاں منصور دی یا دار دا قصہ سنا

چھڈ گنجل دار زلفاں دی بجھارت شاعرا
انقلابِ وقت دی جھنکار دا قصہ سنا

اج وارث دے قلم دی سرسراہٹ نوں بلا
ابنِ قاسم دی جری تلوار دا قصہ سنا

جیہڑے پی کے کجھ شرابی غیرتاں نئیں ویچدے
ساقیا اوس محفلِ سرشار دا قصہ سنا

اج سوہنی تے گھڑے دے قول دا افسانہ لکھ
مڑ کے عزت بیگ دے اقرار دا قصہ سنا

جیہڑے کھڑ کے پھل امیداں دے نئیں کملاوندے
اوس خزاں ناآشنا گلزار دا قصہ سنا

چھیڑ ساغر ونجھلی تے دل دا اک انمول گیت
بن کے رانجھا حسن دی سرکار دا قصہ سنا

پنجابی گیت

ایتھے ہر شے وک دی ئی

بول بول توں کیہہ لینا

ایتھے مُل پیندا تقدیراں دا

ایتھے گھنگھرُوناں زنجیراں دا

ایتھے کھرے تے کھوٹے وِک جاندے

ایتھے چن دے ٹوٹے وِک جاندے

ایتھے آن غریب دی وِک دی اے

ایتھے دل مجبور دا وِک دا اے

بول بول توں کیہہ لینا

دل کہندا اے چناں میں تیری آں

دل کہندا اے چناں میں تیری آں

اکھیاں وِچ رہنا ایں نالے دل وِچ وسناں ایں

ہولی ہولی پلکاں دے اوہلے اوہلے ہسناں ایں

دل کہندا اے چناں میں تیری آں

توں رُس جاناں ایں جہان رُس جاندا اے

جیہا میرا دین تے ایمان رُس جاندا اے

پھُل مینوں لگدے نیں کَنڈیاں دیا ڈھیریاں

دل کہندا اے چناں میں تیری آں

گلے بھر کے پاؤنیاں میں تیریاں جُھارتاں

پیار دیاں جگ کولوں لے لے توں شہادتاں

ہولی ہولی کردے نیں لوکی گلاں میریاں

دل کہندا اے چناں میں تیری آں

دل کہندا اے چناں میں تیری آں



ساغر صدیقی مرحوم اپنے دوست ریاض تسنیم مرحوم کے ساتھ

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے،

شعریات

کلیات حسرت: حسرت موہانی - ۴۳۲ صفحات - سائز ۱/۲ ۶" × ۱/۲ ۸"
مولانا حسرت موہانی کی بلند پایہ غزلیں معہ حالات و تبصرہ - قیمت -/۱۵

ریاضِ رضواں: تہذیب رئیس احمد جعفری - ۷۳۲ صفحات - سائز ۱/۲ ۶ × ۱۰"
ریاض خیرآبادی کی بلند پایہ غزلوں، قطعات اور رباعیات کا گراں بہا مجموعہ -/۳۰

دل کی باتیں: میر نسیم محمود - ۱۴۸ صفحات - سائز ۱/۲ ۵" × ۹"
فکر انگیز غزلیں اور نظمیں جو دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر دل کی باتیں کہنے لگتی ہیں ۴/۵۰

متاعِ جنوں: ہوش ترمذی - ۱۷۶ صفحات - سائز ۱/۲ ۵" × ۹"
ہوش ترمذی مرحوم کی غزلیات کا ایک اچھوتا انتخاب - پیش لفظ عابد علی عابد -/۶

گھاس کی پتیاں: والٹ وٹمن - ترجمہ قیوم نظر - صفحات ۱۵۴ - سائز ۱/۲ ۵" × ۹"
وٹمن کی نظموں کا رواں دواں ترجمہ - انگریزی نظموں کے مقابل منظوم ترجمہ -/۱۰

نوائے سروش: مولانا غلام رسول مہر - صفحات ۱۰۹۶ - سائز ۱/۲ ۵" × ۹"
دیوان غالب کی مکمل شرح - اشعار کے بعد ترجمہ اور الفاظی معانی کے ساتھ ساتھ شرح -/۳۵

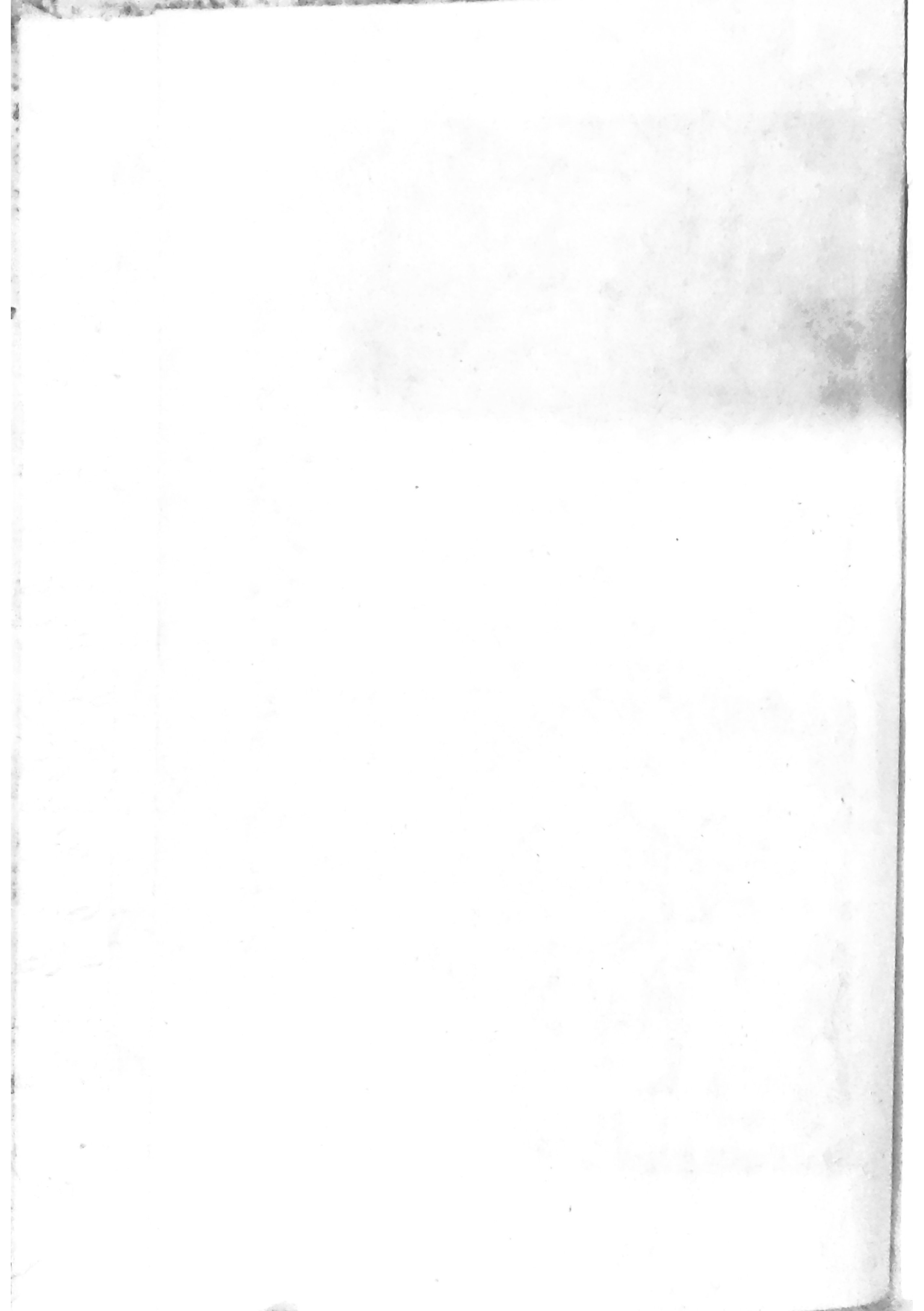
دیوان حافظ مترجم: نشتر جالندھری - صفحات ۴۷۲ - سائز ۱/۲ ۷" × ۱۰"
فارسی کلام کے ساتھ ساتھ سلیس اردو ترجمہ - مع حواشی اور توضیحات -/۲۰

احوال و رباعیاتِ خیام: مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی صفحات ۳۷۶ - سائز ۱/۲ ۶" × ۱۰"
ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہر رباعی کی مکمل و مفصل تشریح - ۱۰۰ صفحات پر مکمل و جامع سوانح -/۱۵

مراثی انیس: (مکمل ۴ جلدیں) مرتبہ نائب حسین نقوی - ۱۷۵۰ صفحات سائز ۱/۲ ۷" × ۱۱"
میر انیس کے بلند پایہ کلام کا مکمل ترین مجموعہ - فی جلد -/۲۰، مکمل سیٹ -/۸۰

دیوانِ غالب: (عکسی) مرتبہ غلام رسول مہر ۳۰۰ صفحات - سائز ۵" × ۱/۲ ۷"
غالب کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام - جدید اضافات اور حواشی - رف -/۶ سفید گلیز -/۸

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز لاہور، حیدرآباد، کراچی



عبدالعزیز خالد کا شعری ادب



- فارقلیط : آں حضرتؐ کی سیرت پر عالمانہ شعری ادب (تیسرا ایڈیشن) ۱۸/۰
- سلومی : ایک مشہور منظوم ڈرامہ (تیسرا ایڈیشن) قیمت ۱۰/۰
- دُکانِ شیشہ گر : حقائق کی منظوم کہانیاں (تیسرا ایڈیشن) ۱۸/۰
- برگِ خزاں : زندگی کے بھرپور عکاس منظوم ڈرامے (تیسرا ایڈیشن) ۱۸/۰
- ورقِ ناخواندہ : پانچ بے مثال تمثیلوں کا مجموعہ (دُوسرا ایڈیشن) ۱۰/۰
- زنجیرِ رمِ آہو : لازوال شعری جذبات کا مجموعہ (تیسرا ایڈیشن) ۱۵/۰
- کفِ دریا : حیات سے مملو احساسات کا مرقّع (دُوسرا ایڈیشن) ۱۰/۰
- کِلکِ موج : ع پریشاں می نویسد کلکِ موج احوالِ دریا را (دُوسرا ایڈیشن) ۱۸/۰
- غزل الغزلات : نغمۂ سلیمان کا ترجمہ۔ قیمت :- ۱۰/۰
- گُلِ نغمہ : رابندر ناتھ ٹیگور کی "گُلِ نغمہ" کا منظوم ترجمہ ۱۸/۰



شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ◉ حیدرآباد ◉ کراچی